94

تخلیق

انوار فیروز

جاوید اختر

نصیر الدین شیخ

لطیف قریشی

اُم لیلیٰ

خالدہ سعید

فون : ۷۲۳۰۸۰۷

ماہنامہ تخلیق لاہور

جلد — ۲۸ ● فروری ۱۹۹۷ء ● شمارہ — ۲

مُدیر : اظہر جاوید

قیمت فی پرچہ — ۲۰ بیس روپے
سالانہ — ۱۵۰ ایک سو پچاس روپے

بھگوان سٹریٹ — پرانی انارکلی لاہور ۵۴۰۰۰

ترتیب

اپنی بات ۵

جمہوریت اور قومی مفاد — سٹروب طالبوٹ
ترجمہ: ظفر عظیم ۷

ترجمے کے مسائل — بلراج کومل ۲۵

نظمیں۔ ہائیکو۔ گیت۔ ماہیے

آذرِ وقت کے نام — احمد ظفر ۲۹

زیاں آئینوں کا — جمیل ملک ۳۰

ہائیکو — آفاق صدیقی ۳۱

گیت — ناصر شہزاد ۳۱

آرزو — مدہوش بلگرامی ۳۲

دُعا — کیول سُوری ۳۳

ماہیے — محمد سبطین شاہجہانی ۳۴

سفید پرچم جلا ہوا ہے — شاہین بدر ۳۴

رنگ — نسیم سحر ۳۵

بھرے گھر کی تنہائی — کرشن ادیب ۳۵

تنہائی — زہیر کنجاہی ۳۶

نظمیں — احمد صغیر صدیقی ۳۷

آواز — خالدہ سعید ۳۷

اقرار — رخشندہ نوید ۳۸

زیرِ اثر — خالد نصر راجہ ۳۸

افسانے

آخری اسٹیشن — امراؤ طارق ۲۹

مجاہد — پروین سرور ۴۳

سمندر اور ساحل — شمشاد احمد ۵۱

غزلیں

جگن ناتھ آزاد۔ قتیل شفائی۔ احمد راہی۔ شفیع عقیل۔ جعفر شیرازی۔ حسن اختر جلیل۔ عبدالقوی ضیاؔ۔ افضل منہاس۔ جگر جالندھری۔ کرشن کمار طور۔ انوار فیروز۔ انور شعور۔ صابر آفاقی۔ عاصی کاشمیری۔ صابر ظفر۔ سرور کاشمیری۔ اُم لیلیٰ۔ نعیمہ ضیاء الدین۔ صبیحہ صبا۔ حیدر قریشی۔ قمر حیدر قمر۔ کاوش عباسی۔ رب نواز مائل۔ زاہد امیر۔ شہباز ندیم۔ غنا کاشمیری۔ جاوید راہی۔ آغا ریاض احمد۔ محمد حسین کنول۔ اخلاق عاطف۔ سرور ارمان۔ ریاض نسیم۔ معظم سعید۔ حسن اعزاز۔ یاسمین سحر۔ عارف فرہاد۔ ۵۵

سفرنامے

وادیٔ بروغل — مستنصر حسین تارڑ ۷۵

آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں — بُشریٰ اعجاز ۸۳

خصوصی مطالعہ

حقیقت نگار مصور اور شاعر	امین ہاشمی	۸۷
غزلیں	نصیر الدین شیخ	۹۱

جائزے

ترکش - ایک جائزہ	وارث علوی	۹۳
جھروکے - ایک سرسری مطالعہ	محمد عالم خان	۱۰۳

پنجاب رنگ

پھٹک (ہجو)	پرویز بزمی	۱۰۷
غزل	سلیم کاشر	۱۱۱
غزل	انور سدید	۱۱۱
سفر دے اندر سفر	ہارون عدیم	۱۱۲
بے عقلاں	لطیف قریشی	۱۱۳
حکایت	محمد اقبال نجمی	۱۱۴
اک نظم	محمد سلیم شہزاد	۱۱۴
غزل	تنویر نوازش	۱۱۵
اپنی موتے مردا	فہیم شناس کاظمی	۱۱۵
غزل	اعجاز روشن	۱۱۶
غزل	آصف شفیع	۱۱۶

انجمن خیال

(خطوط)	۱۱۷	۱۴۰

سرورق

نصیر الدین شیخ

- ناشر ——— اظہر جاوید
- طابع ——— چوہدری فروغ احمد
- مطبع ——— طیبہ پرنٹرز لاہور
- مقامِ اشاعت ——— میکلیگن روڈ لاہور

بسمِ اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اپنی بات

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بار بار دُہرانے سے ان کا حُسن کجلانے لگتا ہے، انہیں سُننے اور پڑھنے والا اکتانے لگتا ہے۔

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بار بار کہنے اور دُہرانے ہی میں اُن کا سارا حُسن ہوتا ہے۔

اکادمی ادبیات قابلِ ذکر ہو نہ ہو، کاپی رائٹ ایکٹ کی بات ایسی ہے کہ اس کا تذکرہ ہوتے رہنا چاہیئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ہم نے اس خفتہ مسئلے کو بیدار کیا تو ٹیلی وژن کے ایک چینل نے اسے اپنی نشریات کا حصہ بنا لیا ـــــ اور اس کے ضابطوں، قاعدوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

ابھی تک چیئرمین اکادمی ادبیات سمیت بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہے ـــــ چیئرمین صاحب (بہادر) نے جواب دعویٰ داخل کرنے کے لئے وکیل کو ہزاروں روپے کی فیس دے دی ہے مگر اہلِ قلم کو چند سو روپے دینے اور شکریے (اور معذرت) کا خط لکھنے کی زحمت نہیں فرمائی۔

چیئرمین صاحب متنازعہ کتابوں کے مرتبین کو دھمکا رہے ہیں کہ یہ سب اُن کا قصور ہے ـــ!

ابھی پہلی کتاب کا معاملہ عدالت میں تھا کہ اکادمی کے کارپردازوں نے ایک دوسری کتاب شائع کر دی ہے جس میں ایک بار پھر کاپی رائٹ ایکٹ کو پسِ پشت ڈالا گیا ہے۔

وہ زُعم میں ہیں کہ عدالتوں کی معرفت انصاف بہت تاخیر سے مِلتا ہے۔

مجھے تسلی ہے کہ آج نہیں تو کل ـــــ آخر مل تو جائے گا۔ حکومتیں بدل گئیں تو کیا ہوا، قانون تو نہیں بدلے گا؛ چڑھتے سورج کو پوجنا اُن کی مجبوری ہے، میرا مسئلہ نہیں۔

پہلے مقدمے کے بعد، اب دوسرا مقدمہ بھی عدالت میں جا چکا ہے۔

آج ادب کا، اہلِ ادب کا یہی سب سے اہم مسئلہ ہے۔ آپ کس منہ سے انٹرنیشنل لٹریری کانفرنس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور ادیبوں کو اور نئے حکمرانوں کو اس کی تحریص و ترغیب دیتے ہیں ـــ؟ کیا پوری دنیا میں کہیں بھی ادیبوں کے حقوق کی نگہداشت کرنے والے ادارے انہیں پامال کرتے ہیں ـــ؟ حتیٰ کہ ـــــ بھارت میں بھی ایسا نہیں ہوتا ـــــ نہیں ہو سکتا ـــــ

انٹرنیشنل کانفرنس کے پسِ پردہ کس کس کے کیا کیا مقاصد ہیں، اخبارات نے اس کی دھجیاں اڑائی ہیں، میں ابھی اس بات کو نہیں کھولتا ـــ ایک قضیہ ختم ہو جائے تو پھر بات آگے چلے۔

اظہر جاوید

جمہوریت اور قومی مفاد

تحریر :۔ سٹروب طالبوٹ (Strobe Talbot)
ترجمہ :۔ ظفر عظیم

سٹوروب طالبوٹ کے بارے اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ ہیں۔

زیر نظر مضمون Democracy and the National Interest امریکی رسالہ فارن آفیئرز (Foreign Affairs) کے شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۹۶ء سے لیا گیا ہے۔ جمہوریت اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے یہ ایک انتہائی اہم مضمون ہے اور اس میں جمہوریت پھیلانے کی امریکی کوششوں کے نقوش نظر آتے ہیں۔

(ادارہ)

تقریباً" پانچ سال قبل امریکی صدارت کے چناؤ کے لئے چلائی گئی ابتدائی مہم کے دوران کلنٹن نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں بین الاقوامی زندگی میں جمہوریت بطور اک عنصر کے موضوع پر تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ممالک جن کے شہری اپنے قائدین کے چناؤ میں آزاد ہیں تجارت اور سفارت کاری کے ضمن میں حکومتوں کی کسی دوسری ہیئت کے برعکس زیادہ بااعتماد ساتھی بن سکتے ہیں اور ان کا امن کے لیے کسی قسم کا خطرہ بننے کے امکانات بھی کم ہیں۔

لاطینی امریکہ، ایشیا، مرکزی یورپ اور سابقہ سوویت یونین کے ضمن میں انہوں نے بطور صدر اپنی انتظامیہ کی خارجہ پالیسی میں نظریاتی سیاست کے اصولوں کو عملی جامعہ پہنایا اور امریکی امداد کو جمہوریت کی بقاء کے لیے بطور ترجیح استعمال کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے کانگریس پر زور دیا کہ وہ پرامن دور کے دوران بھی ایسی غیر ملکی امداد کو جاری رکھنے کی اجازت دے جو چناؤ اور قانون کی حکمرانی کے فروغ کے لیے مددگار ثابت ہو۔ اس ضمن میں ان کی دلیل یہ تھی کہ آج کا مختصر خرچہ امریکہ کے دور رس مفادات کے لیے سرمایہ کاری ہے۔

دو سال قبل ہیٹی (HAITI) میں صدر کلنٹن نے اکیس ہزار امریکی فوجیوں کو کثیر القومی فوج کے ہراول دستہ کے طور بھیجا تاکہ چناؤ کے ذریعے کامیاب قائد کو جسے فوجی انقلاب کے ذریعے ہٹایا گیا تھا بحال کیا

جا سکے۔ ء کے اوائل میں انہوں نے یہ نظریہ یعنی غلط لوگوں کے چناؤ سے بہتر ہے کہ چناؤ کے انعقاد کو منسوخ کر دیا جائے کو رد کرتے ہوئے روس پر زور دیا کہ مابعد سوویت دور کے پہلے صدارتی انتخاب کا انعقاد کیا جائے۔ ۱۴ستمبر۱۹۹۶ء کو ناٹو (NATO) کے حصار میں ۵۳۰۰۰ مضبوط فوج کو بوسنیا بھیجا تاکہ وہاں چناؤ کو ممکن بنایا جا سکے۔ کمزوریوں اور طوائف الملوکی کے باوجود اس مفلوک الحال ملک کی سرحدوں کی حدود اور گرد و پیش پھیلے ہمسایوں کے حصار میں ایک دیرپا امن کے قیام کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔

مندرجہ بالا تین جگہوں پر امریکی سیاسی قوت کو بروئے کار لانے کی کوشش ..... اور دو معاملات میں فوجی قوت کے اظہار ..... کی وجہ سے خطرات اور اخراجات کا سامنا درپیش ہوا اور اسی وجہ سے یہ معاملات اختلاف کا شکار ہوئے۔ مندرجہ بالا ممالک میں کسی میں بھی جمہوریت کی کوئی حتمی فتح نہیں ہوئی۔ پچھلے چند سالوں نے ہمیں یاد دہانی کرائی تھی کہ جہاں میں چہار سو جمہوریت کا راہ سفر کس قدر پر تذبذب' تکلیف دہ اور مکمل طور پر غیر منظم ہو سکتا ہے۔ کئی ایک ممالک میں جو صدیوں نہیں تو دہائیوں سے جبرو استعداد تلے پس رہے تھے وہاں آزادی کے احساس مسرت نے آنے والی صبح کے لیے متانت اور سنجیدگی پیدا کی۔

غیر ملکوں میں جمہوریت کے اصرار پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نکتہ چینی نہ صرف تنہائی پسندوں کی طرف سے آئی بلکہ کچھ بین الاقوامیت پرستوں کی طرف سے بھی جن کا خیال ہے کہ جمہوریت کے حق میں جذباتی جنگ امریکی وسائل کو زیادہ پھیلا دے گی اور امریکہ کو بلامقصد' کمزور چیخ و پکار اور اکثر غیر مستحق کفیل کے حقوق کی خاطر دلدل میں پھنسا دے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو دوسرے ممالک کی خارجہ' دفاعی اور تجارتی پالیسیوں پر اثر انداز ہونا چاہیے کیوں کہ یہ امریکہ کے ذاتی قومی مفادات کے لیے نمایاں طور پر تعلق پذیر ہیں (۱)

اس خیال کے حامی اکثر اپنے آپ کو حقیقت پسند کہتے ہیں تاکہ وہ اون کی طرح نرم ذہن اور غیر عملی اشخاص کے مقابلے میں اپنی جداگانہ شناخت کرا سکیں۔ جو اس خیال میں مسحور ہیں کہ دیگر ممالک کے اندرونی معاملات میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اثر انداز ہو سکتا ہے اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود کہ غیر حقیقی نکتہ چینی موجودہ عہد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ چہار سو پھیلی تجارتی منڈی کی وسعت اور ساتھ ہی ساتھ جغرافیائی خطوں کی گہری اور پھیلتی ہوئی آپس کی انحصاری کو مدنظر رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس ضمن یہ سب کچھ غیر حقیقت پسندی ہے۔

تکنیکی' کاروباری اور سیاسی رجحانات کا جمگھٹا فاصلوں کو کم کر رہا ہے' سرحدوں کو کھول رہا ہے اور انتہائی دور وقوع پذیر سماجوں اور معیشتوں کو آپس میں ملا رہا ہے۔ ان تبدیلیوں سے نئے فوائد اور خطرات کا سامنا ہے۔ جونہی مصنوعات اور خدمات (Services) زیادہ تیزی اور آزادی سے ادھر ادھر پھیلیں گی اسی

طرح بیماریاں' منشیات' جرائم پیشہ لوگ' دہشت گرد لوگ اور ساتھ ہی ساتھ ماحول کی آلودگی کے اور تباہی کے عناصر اور نتائج بھی پھیلیں گے۔

انحصاری کی بڑھتی ہوئی دنیا میں امریکنوں کا اضافہ پذیر مفاد اس بات میں ہے کہ دوسرے ممالک کس طرح اپنے آپ کو منظم یا غیر منظم کرتے ہیں۔ جتنا اضافہ اور قریبی تعلق اقوام کے سماج میں ہوگا وہ جو جمہوریت کو بطور حکمرانی کی ہیئت کے طور پر تسلیم کریں اتنے ہی امریکن لوگ محفوظ اور خوش حال ہوں گے۔ کیوں کہ جمہورتیں واضح طور پر اپنے بین الاقوامی وعید کو پورا کرنے میں زیادہ فعال ہوں گی اور دہشت گردی یا ماحولیاتی آلودگی میں کم حصہ لیں گی۔ اس طرح ایک دوسرے کے ہمراہ محاذ آرائی کے مواقع بھی کم ہوں گے (۲)

بھرپور انداز میں امداد' فروغ اور حسب ضرورت دوسرے ممالک کی جمہوریتوں کے دفاع کے لیے یہ دلیل قومی دفاع کی عقلی توجیع کا لب لباب ہے۔ یہ بنیاد ہے بیان کیے گئے کچھ حقیقت نگاروں کے مختلف اور چھپے ہوئے استدلال کو رد کرنے اور اصرار کرنے کے لیے کہ امریکی سماج اور اس کے مفادات ایک دوسرے کو تقویت بخشتے ہیں۔

یہ ایمان ظاہر کرتا ہے امریکی خارجہ پالیسی کی اندرون ملکی سیاسی حقیقتوں کو۔ امریکی شہریوں نے کبھی بھی روایتی جغرافیائی سیاست یا حقیقی قوت کے توازن کے اندازوں کو قومی خزانہ کے اضافہ یا امریکی فوجوں کی بیرون ملک ترسیل کے لیے مناسب وجہ نہیں سمجھا۔ موجودہ صدی کے دوران ادھر ادھر فوجوں کی ترسیل کے ضمن میں امریکی حکومت اپنے فیصلوں کی وضاحت کرتی رہی ہے کہ یہ کسی نہ کسی کی درخواست پر ہوا جو جمہوریت کے دفاع کے ضمن میں تھی۔ دوسری جنگ عظیم اور سرد جنگ دونوں میں امریکہ کی شرکت جارحیت کے روک تھام یا اسے خوف زدہ کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ یہ اس مخالفانہ بصارت سے متعلقہ تھی جو فرد واحد اور حکومت کے مابین وجود رکھتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ سب کچھ جبریت بنام آزادی کی جنگ تھی۔

امریکی شہریوں کی خواہش ہے کہ ان کے ملک کی خارجہ حکمت عملی کی جڑیں نظریاتی سیاست کے ساتھ ساتھ حقیقی سیاست سے پیوستہ ہوں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ انفرادی اور شعوری طور پر ایک ایسا ملک ہے جس کی بنیاد اصولوں کے مجموعہ اور نظریات پر مبنی ہے جو ہر جگہ کے شہریوں کے لیے نافذ العمل ہیں۔ پرکھوں نے اعلان کیا تھا کہ تمام انسان یکساں تخلیق ہوئے ہیں اور صرف وہ نہیں جو برطانیہ کی ۱۳ امریکی کالونیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اور یہ کہ زندگی' آزادی اور خوشی کی تلاش جیسے ناقابل تنسیخ حقوق کی حفاظت کے لیے لوگوں کو حق ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست قائم کریں جس میں طاقت کا سرچشمہ عوام کی رضامندی ہو۔

موجودہ لہر

مندرجہ بالا خیال جب ۱۷۷۶ء میں امریکی سیاسی نظام کی بنیاد بنا تو دو صدیوں سے زائد عرصہ یعنی پیری کلس کے زمانہ سے زیادہ تر جمہوریائیں التوا کا شکار تھیں۔ اپنی تاریخ کے زیادہ تر حصہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اقوام کے اس چھوٹے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جنہوں نے اس حق کو کہ شہری بذات خد اپنے آپ پر حکومت کا حق رکھتے ہیں ادارہ کا درجہ دے دیا تھا لیکن پچھلی دو دہائیوں کے دوران اس امریکی خصوصیت کے حامل آدرش نے قوت پکڑی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں دنیا کے ۳۰ فی صد سے بھی کم ممالک میں جمہوریت تھی۔ آج یہ تعداد ۶۱ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ تاریخ میں پہلی بار تھوڑی مگر واضح اکثریت یعنی دنیا کی آبادی کا ۵۴ فی صد حصہ اب جمہوری ممالک میں رہ رہا ہے (۳)

جمہوریت نوازی کی موجودہ نام نہاد تیسری لہر ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں شروع ہوئی جب پرتگال' اسپین اور یونان میں دائیں بازو کی آمریتوں کا خاتمہ ہوا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اس نے زور پکڑا اور پھیلتی چلی گئی (۴)۔ اس میں ٹیکنالوجی غالب عنصر تھی۔ حتیٰ کہ انتہائی سخت حصار بند سرحدیں پہلے ریڈیو پھر ٹیلی ویژن اور بالاخر فیکس اور E ۔ میل کے دھاوا سے تیزی سے قابل سرایت ہوتی چلی گئیں۔

ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ مئی ۱۹۹۲ء میں جب تھائی لینڈ کی فوج نے طلباء کے جمہوری احتجاج کو دبانے کی کوشش کی تو فوج نواز ٹیلی ویژن نے تشدد کے بارے اطلاعات کو روک دیا۔ لیکن تھائی لینڈ کے کاروباری اور پروفیشنلز کے حلقہ نے یہ سب کچھ C N N چینل پر دیکھا۔ اور وہ احتجاجاً" بنکاک کی گلیوں میں نکل آئے۔ ستمبر تک منتخب شدہ حکومت بحال ہوچکی تھی۔

سرکاری ادارہ جات کی اس اہلیت میں اضافہ سے کہ وہ لوگوں پر نظر رکھ سکیں اور ان کی ذاتی زندگی میں جھانک سکنے کی بدولت یوں محسوس ہوتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی شاید اک ملی جلی رحمت ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس کے اثرات مثبت ہی ہیں۔ الیکٹرونک اور ابلاغ کے انقلاب نے سرکاری مشیری کو مضبوط کرنے کی بجائے کمزور کیا ہے۔ جارج آرویل کی اس ضمن میں پیشگوئی غلط ثابت ہوئی۔

جدید جمہوریت اس لیے بھی پھیلی کیوں کہ یہ ریاستوں کو اپنی معیشت کو جدید راہوں پر استوار کرنے' سماجی حالات کو بہتر بنانے اور بیرونی دنیا کے ساتھ روابط استوار کرنے میں مدد کرتی ہے۔ ایک نمائندہ حکومتی نظام میں قائدین کا لوگوں کے سامنے جواب دہ ہونے کے زیادہ مواقع ہیں گو رشوت ستانی' جمہوری ریاستوں میں بہت زیادہ عام ہے بشمول مناسب اور مضبوط جمہوریتوں کے۔ مگر اختیارات کے غلط استعمال کو ایک نمائندہ پارلیمنٹ' آزاد عدلیہ اور پریس ہی روک سکتے ہیں۔

تحکم پسند نظام حکومت اور ان کے دفاع کرنے والے بعض اوقات دعویٰ کرتے ہیں کہ جمہوریت معاشی

لحاظ سے نااہل ہے۔ اور یہ کہ خاص طور پر غریب اقوام میں روشن خیال آمریت معاشی ترقی کو آگے بڑھانے میں زیادہ پراثر ہے۔ گو تاریخ زیادہ واضح نہیں لیکن یہ آمریت پسند حکمرانوں کو بری الذمہ کرنے سے بہت دور ہے۔ ایک مضبوط حکمران اپنی قوم کو غربت اور طوائف الملوکی سے نجات دلا سکتا ہے لیکن مہربان ترین آمر کا خاتمہ لارڈ آکٹن کے مقولے کو صحیح ثابت کرنے پر منتج ہوگا جو طاقت کے استعمال کی ناجائز پن کے بارے ہے۔ یعنی اگر روشن خیال آمر خود ایسا نہیں کرتا تو اس کے ممتاز روشن خیال جانشین ایسا کرنے پر حائل ہوں گے (۵)

دنیا کے کچھ غریب تر ملکوں میں مثلاً نکاراگوا اور مالاوی میں منتخب قائدین نے ثابت کیا کہ وہ اپنے استبدادی یا آمر پیش رو کے برعکس لوگوں کی بھلائی کے لیے حکمت عملیوں کو اپنانے میں زیادہ بہتر تھے۔ جمہوری قوموں کی طاقت کا سرچشمہ ایک اضافی اور اہم ذریعہ اس کی جائز پذیری ہے جو معیشت اور وسائل کی تقسیم کے ضمن میں تکلیف دہ اور ضروری فیصلوں کے لیے ان کی قوت میں اضافہ کرتا ہے (۶)۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ممتاز معیشت دان امرتیہ سین دلیل پیش کرتا ہے کہ ان ممالک میں جہاں جمہوری حکومتیں قائم تھیں اور نسبتاً آزاد وہاں کبھی کوئی قابل ذکر قحط نہیں پڑا۔ وہ نشان دہی کرتا ہے کہ ہندوستان کو اپنی تاریخ کے ادوار میں سیاہ ترین قحطوں کا سامنا کرنا پڑا بشمول ۱۹۴۳ء میں واقع ہوئے قحط کا جس میں بیس سے تیس لاکھ لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ بننے کے بعد اس نے کسی قابل ذکر قحط کا سامنا نہیں کیا۔ فصلوں کی ناکامی اور خوراک کی کمی کے باوجود اسی طرح قحط روکنے کے وہ پروگرام جنہیں جمہوری حکومتوں نے روا کیا ان میں شامل بو تسوانا اور زمبابوے ہیں جہاں جمہوری حکومتوں کے فیصلوں کے سبب یہ ممالک فصلوں کی ناکامی کے اثرات کو برداشت کرنے کے قابل ہوئے۔ سین کے مشاہدہ کے مطابق ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سوڈان اور ایتھوپیا فصلوں کی قدرے کم تباہی کے باوجود قحط سالی کا شکار ہوئے (۷)

پھیلتی ہوئی اتفاق رائے

بیرونی جمہوریتوں کی امداد کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لیے فوائد اور کشش کو دیگر حکمت عملیوں کے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ عبوری ادوار کو پھیلانے کی مشکلات کے برعکس یہ اگر ناپائیداری نہیں لاتا تو ناگزیر طور پر رکاوٹیں پیدا کرے گا۔ ۱۷۸ سال قبل ہسپانوی کالونیوں میں آزادی کی تحریکوں کے لیے امریکی امداد کے ضمن میں ہنری کلے (Henry Clay) نے ایک معیار تجویز کیا تھا جو آج بھی درست ہے۔ "ہم اپنی آزادی اور معیارات کو دوسری اقوام پر نہیں ٹھونسیں گے اگر وہ انہیں پسند نہیں کرتے۔ لیکن اگر پسے ہوئے اور نادار لوگ آزادی کی خواہش رکھتے ہیں اور اسے قائم کرنا چاہیں گے

اور اگر حقیقی معنوں میں انہوں نے اسے حاصل کر لیا ہے تو ایک مقتدر قوت کی حیثیت سے ہمیں حق ہے کہ اس مسئلہ پر غور کریں اور جس طرح ہمارے مفادات اور حالات اجازت دیں اوراس پرہم عمل پیرا ہوں۔"

جمہوریت کی مدد انتہائی ناگزیر نہیں جو خود بخود دیگر مسابقتی مقاصد پر ترجیح حاصل کرتی ہو بلکہ یہ ایک مضبوط دھاگہ ہے جس سے امریکی خارجہ حکمت عملی کا پیچیدہ اور آرائشی کپڑا بنا ہوا ہے۔امریکہ میں پچھلے ۲۰ سالوں میں ری پبلیکن اور ڈیمو کریٹک دونوں سیاسی پارٹیوں کے صدور کو کئی اہم لمحات میں اپنے حالات اور مفادات سے ہم آہنگ فیصلے کرنا پڑے تاکہ جمہوریت کے فروغ کو درست ثابت کیا جاسکے۔

۱۹۸۰ء کی دہائیوں کے درمیانی عرصہ میں جب فلپائن میں فرڈیننڈ مارکوس کے خلاف پرامن تحریک اٹھی تو امریکی کانگریس اور غیر سرکاری انسانی حقوق کی انجمنیں ریگن انتظامیہ پر حاوی ہوگئیں۔ اس امر پر کہ لوگوں کی تحریک کی حمایت کی جائے اور مارکوس کو ملک بدر ہونے پر مجبور کیا جائے۔ حتیٰ کہ خارجہ پالیسی کی پیش قدمی' یعنی نکاراگواء میں کنٹرا ((Contra) باغیوں کی حمایت جمہوریت کی تحریک کے لئے بہتر ثابت ہوئی۔ امریکی دباؤ سینڈی نستا (Sandinista) حکومت کے لئے ۱۹۹۰ء میں آزاد اور شفاف چناؤ کے ضمن میں مددگار ثابت ہوا۔ حزب اختلاف کا امیدوار باریوس دو چامارو (Barrios De Chamorro) الیکشن جیت گیا اور سندا نیستا نے نتائج کو تسلیم کرلیا۔ نکاراگوا کے لوگ پھر دوبارہ رائے شماری کی طرف گئے تاکہ حکومت کی ہر منزل پر اپنے راہنماؤں کو چن سکیں۔ ایک نوخیز جمہوریت کا نازک امتحان پاس کرتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے چناؤ کا انعقاد کیا۔

اس پہلے آزاد' شفاف اور وسیع چناؤ جس کا انعقاد اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کمبوڈیا میں پہلی دفعہ ہوا،اس کی راہنمائی بش انتظامیہ نے کی۔ جب کمبوڈیا کے لوگوں کو ۱۹۹۳ء کے اوائل میں ووٹ دینے کا موقع ملا تو نوے فیصد سے زائد اہل لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ بہت سے لوگوں نے کھمر روج (Khmar Rouge) کی قاتلانہ دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر اور بارودی سرنگوں کے درمیان سے پولنگ اسٹیشن گئے۔

لاطینی امریکہ میں ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں نیا رجحان شروع ہوا جب ارجنٹائن' برازیل اور چلی نے فوجی آمریت کے عبوری دور سے شہری حکومت کی طرف منتقلی کی تو پارلیمانی نظام نہ صرف پائیدار ہوا بلکہ خود تقویتی ثابت ہوا۔ ۱۹۹۱ء میں امریکن ریاستوں کی تنظیم نے امریکہ کے کہنے پر قراردار نمبر ۱۰۸۰ منظور کی جس کے مطابق ممبر ریاستوں کے وزرائے خارجہ امریکی براعظم میں جمہوریت کے رکاوٹ کی صورت میں باہم اکٹھا ہوں گے۔ جب گوئٹے مالا کے صدر جارج سی رانو نے ۱۹۹۳ء میں آئینی حکومت کو معزول کیا تو امریکی ریاستوں کی تنظیم نے قراردار نمبر ۱۰۸۰ کے مطابق اس عمل کو مسترد کیا اور معاشی و سیاسی پابندیوں کی

دھمکی دی۔ اس خطرہ کو بھانپتے ہوئے سی رانو مستعفی ہوگئے اور آئینی حکومت کو بحال کردیا گیا۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۵ء میں پیرو اور ایکواڈور کی سرحدوں کے درمیان لڑائی کا چھڑ جانا اس اصول کو للکارنا تھا کہ جمہوریتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ارجنٹائن' برازیل اور چلی کی مدد سے لڑائی کے پھیلاؤ کو روک دیا گیا۔ امن کے لئے موجود قوتوں سے ایک یہ تھی کہ متحارب گروہوں میں سے کوئی بھی براعظم کی منڈی نواز جمہوریتوں کی کمیونٹی سے حقہ پانی بند نہیں کرانا چاہتا تھا۔

اپریل ۱۹۹۶ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ' امریکی ریاستوں کی تنظیم مارکوسر (Mercousr) یعنی جنوبی امریکی کسٹم یونین نے مل کر Paraguay کی جمہوریت کا دفاع کیا جہاں فوج کا کمانڈر حکومت کو برطرف کرنا چاہتا تھا۔ مارکوسر نے اس کے بعد اپنے چارٹر میں ترمیم کردی ہے کہ وہ ممبر جو جمہوری اداروں کے مکمل عملدرآمد سے دست بردار ہوگا اسے ممبرشپ سے خارج کردیا جائے گا۔

اسرائیل کے ماسوا مشرق وسطیٰ کا سیاسی' مذہبی اور سماجی خطہ جمہوریت کے لئے کوئی خوشگوار خطہ نہیں ہے۔ لیکن اس خطہ میں بھی ارتقا کے عارضی آثار ہویدا ہیں۔ کئی ایک عرب ممالک میں امریکہ کی مدد سے بالخصوص کویت' یمن اور اردن میں کامیاب اور یکے بعد دیگرے مساوی پارلیمانی چناؤ ہوئے ہیں۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں فلسطین نے حکومتی تنظیم کا چناؤ کیا جس کا انعقاد اسرائیل کے ساتھ سمجھوتے کی وجہ سے عمل میں آیا۔

حتیٰ کہ افریقہ میں جہاں جمہوری ادارہ سازی کو کچھ انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کچھ سمتوں میں انتہائی حوصلہ شکن پسپائی سے متاثر ہونا پڑا۔ لیکن امید کی وجوہات ہیں یعنی مسلسل امریکی جدوجہد۔ جنوبی افریقہ جو نسل پرستی سے باہر نکل آیا ہے اس پھیلے ہوئے خطہ میں ایک مضبوط اور مثبت مثال ہے۔ سیرالیون (Sierra Leone) میں مارچ کے چناؤ ملک کی پانچ سالہ پرانی خانہ جنگی میں وقفہ کا حامل ہوا۔ عوامی قیادت اور باغیوں نے لوگوں کی اس خواہش پر ردعمل کا اظہار کیا کہ لڑائی کا خاتمہ کیا جائے۔

افریقی ممالک میں انفرادی ترقی اس رجحان کو مستحکم کرنے کے لئے امداد باہمی کی کوششوں کی جانب راہنمائی کررہی ہے۔ جب اگست ۱۹۹۶ء میں لیسوتھو (Lesotho) کے حکمران نے پارلیمنٹ کو توڑنے کی دھمکی دی تو جنوبی افریقہ' زمبابوے اور بوستوانا کے منتخب شدہ صدور نے اکٹھے ہوکر اس پر جمہوریت کی بقاء کے لئے دباؤ ڈالا۔ اسی سال ازاں بعد سابقہ متحدہ ریاستوں کی رہنما جنہوں نے جنوبی افریقہ میں سفید فام حکومت کی مخالفت کی تھی بعد از نسل پرست جنوبی افریقہ' لیسوتھو' سوازی لینڈ اور مالاوی کے ساتھ شامل ہوکر موزمبیق (Mozambique) کی مساوی جماعتوں کو آمادہ کرنے اور اقوام متحدہ کی زیر نگرانی چناؤ

میں شمولیت اور اس کے نتائج کو تسلیم کرنے کے لئے دباؤ ڈالا۔ جمہوریت ساز ادارہ جات کا انتہائی ڈرامائی پھیلاؤ سابقہ سوویت سلطنت میں آیا ہے۔ وہاں بھی حالات نے اور ویل کی پیشگوئی کو غلط ثابت کردیا اور سرد جنگ کے عقاب نما تصور پسندوں کے خواب کو صرف آدھا صحیح کیا۔ سوویت کمیونسٹ نظام برباد ہوگیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ مغرب کی فوجی قوتوں نے اسے روکا بلکہ اس لئے بھی کہ آزادی اظہار اور دیگر تصورات بشمول عظیم جمہوری تصور اس نظام میں سرایت کرچکے تھے۔ آہنی پردوں کی مسماری کے بعد معاہدہ وارسا اختتام پذیر ہوا اور سوویت یونین کا خاتمہ ہوا۔ ڈومینو تصور الٹ چل گیا۔ یکے بعد دیگرے کمیونسٹ ممالک میں چناؤ کا انعقاد ہوا۔ ایک حالیہ مثال جون میں سامنے آئی جب منگولیا میں لوگوں نے ملک کے تیسرے جمہوری چناؤ میں حصہ لیا۔ اہل ووٹرز میں سے ۹۲ فیصدی نے ووٹ کا استعمال کیا۔ بہت سے لوگوں نے اس لئے گھنٹوں گھوڑوں کی پشت پر سفر کیا اور ووٹ ڈالا۔ انہوں نے جمہوریت پسند حزب اختلاف کو غیر متوقع اور بھاری اکثریت سے فتح دلوائی۔

چہار سو پھیلتے واقعات کی یہ کڑیاں۔ جس میں شامل ہیں ۱۹۸۹ء کی قومی کردار کی حامل چینی جمہوری مہم، فلپائن، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا کے چناؤ اور بالکل حالیہ چناؤ جس کی بدولت غازہ اور جریکو میں فلسطینی حاکمیت کے حقوق کی ادائیگی اور تائیوان کو پہلا آزادانہ منتخب شدہ صدر نصیب ہوا۔ اس دعویٰ کو رد کردینا چاہیے تھا کہ جمہوریت صرف ایک مغربی ادارہ ہے اس دلیل کا بھی خاتمہ کردینا چاہیے تھا کہ کچھ سماج اور تہذیبیں جمہوریت کے لئے زیادہ سازگار ہیں۔ اور یہ کہ ایشیائی کنفیوشن جبریت کے تحت رہنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ لاطینی امریکن فوجیوں اور اسلحہ برداروں کے سائے میں زندہ رہیں گے۔ افریقی قبائلی سرداروں کے تحت اور عرب اور ایرانی استبدادی دینی حکومتوں کے تحت۔ روسی زار یا کیسار کے تحت۔ گھسے پٹے قومی کردار کا زندہ رہنا اس پالیسی کی بنیاد ہے جو تمام اقوام کو جبریت کی طرف دھکیلتا ہے اور اس بے راہ رو تصور کی طرف بھی کہ قسمت یہی ہے جس کے حقدار ہم تھے یا یہ کہ یہ سب کچھ ہی جینز (Genes) میں پوشیدہ ہے۔

آدھا بھرا ہوا گلاس

خیال یہ ہے کہ جمہوریت ہر جگہ امکانی طور پر ممکن ہے۔ مگر جمہوریت سازی کا طریقہ کار مشکل اور طویل ہے۔ بالخصوص ان ممالک کے لئے جہاں سیاسی ارتقا معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے مقید ہے۔ غربت، غیر ترقی یافتگی اور نمو کی رکاوٹ جبریت کے لئے عذر عدم موجودگی نہیں ہے لیکن یہ آزادی کی راہ کی رکاوٹیں ہیں۔ بہت سے ممالک میں غریب اور امیر کے درمیان تفاوت پھیلتی جارہی ہے اور ریاست دوہرے راہ سفر کا شکار ہے۔ یعنی جبریت سے جمہوری سیاست اور مرکزی معیشت سے منڈی نواز معیشت۔ کچھ

خطوں میں ایک اضافہ شدہ بوجھ ناقابل برداشت آبادی کا اضافہ ہے۔ حتیٰ کہ آزادانہ منتخب شدہ اور اچھی نیت رکھنے والے قائدین کے باوجود ان ممالک میں بڑھتی ہوئی شرح پیدائش معاشی ترقی کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے اور قدرتی وسائل کا خاتمہ کردیتی ہے۔ وہاں جمہوری حکومت کا چلنا غیر یقینی ہے۔

جمہوریت کی آغوش میں آنے والے بہت سے صرف نصف آزادی کے اہل ہیں (۸)۔ نوخیز جمہورتیں خصوصاً" وہ ممالک جہاں خانہ جنگی کے زخم ابھی تک ہرے ہیں اور استبدادی دور کی یادیں ابھی تک تازہ ہیں سیاست مخصوص انداز میں متلون ہوسکتی ہے۔ پرانے دور کے زندہ اور ممتاز شہری حصوں میں منقسم ہوجاتے ہیں اور نئے نظم میں فوائد حاصل کرنے کے لئے دست و گریباں ہوجاتے ہیں۔ یا نئی بے نظمی کو مزید خراب کرنے کے لئے تیار۔ نئے منتخب شدہ قائدین یا تو قوت پر اپنے اثر کے بارے غیر یقین ہوتے ہیں یا اپنی معصومیت اور ناگزیری پر بہت زیادہ پر یقین۔ وہ حزب اختلاف کو خاموش کرنے کے لئے جبریت سے کام لیتے ہیں یعنی یا تو نمک حلال ہوجاؤ یا دوسرے حالات کے لئے تیار۔

البانیہ میں جمہوریت کے فروغ کے لئے پانچ سالہ ارتقا کے دوران سالی بے شا کی حکومت نے مئی میں پارلیمانی چناؤ اپنی زیر نگرانی کرائے جو بیلٹ بکس بھرنے' ووٹرز کو ہراساں کرنے اور گنتی کی بے قاعدگیوں کا شکار ہوگئے۔ کمبوڈیا کی سیاست' ماضی قریب میں کھمیر روج کی بربریت سے بہت زیادہ بہتر ہے لیکن ابھی جھٹکوں کا شکار ہے۔ اکثر معاملہ تشدد تک جا پہنچتا ہے۔

کمیونسٹ دنیا کے خاتمہ کے بعد اب تک خاص طور پر سوویت یونین میں سکھ کا سانس اور خوشی کی کیفیت موجود ہے۔ ایک نااہل افسر شاہی اور تحکمانہ نظام کے چھٹکارا سے جس نے وسیع آزردگی پھیلائی۔ جسے اکثر دیکھا جاتا ہے بطور منڈی کی بے قاعدگی اور عدم مساوات کے طور۔ حفاظت کے حصار کی غیر موجودگی میں وسیع تر معاشی ترقی کے امکانات کے بغیر ووٹ دہندہ پر سیاست اور سیاست دانوں کے اکثر کا زائل ہونا یقینی ہے اور اس طرح جمہوریت سے بذات خود بھی۔ غلامی سے نو آزاد شہری غیر حقیقی اور اعلیٰ امیدوں سے وابستگی کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ اپنے منتخب راہنماؤں کے بارے بھی غلط فہمی میں کہ وہ کیا تمنائیں پوری کرسکتے ہیں اور اس ضمن میں کتنا عرصہ لگے گا اور کس قدر محنت کرنا ہوگی۔ جب یہ تمنائیں مایوسی میں تبدیل ہوجاتی ہیں تو پھر ووٹ دہندہ بے وقوفی یا خطرناک اثاثی نسخہ جو خوف یا ماضی پرستی کے سبب جذباتیت کا میر سامان بن سکتا ہے۔

مختصراً" تیسرے دور نے ایک لوٹتی موج پیدا کی ہے بہت سے ان ممالک میں جنہوں نے جمہوری رنگ پھیلانے کے کام کو ہاتھ میں لیا ہے۔

جارح اور مضبوطی سے قائم نظام بھی موجود ہیں۔ مغربی نصف کرہ زمین پر کیوبا اکیلا جبری نظام ہے اور

شمالی کوریا بھی قائم و دائم ہے ایک بے لچک اور اکڑے ہوئے تضاد کے طور پر جنوبی کوریا کی ترقی کرتی جمہوریت کے برعکس۔ برما میں فوجیوں کی سیاسی ٹولی جمہوریت کی تحریکیں کچل دیتی ہے۔ آنگ سائی سوکی جس کی جماعت نے ۱۹۹۰ء عوامی چناؤ میں زوردار کامیابی حاصل کی وہ آج تک نظربند ہے۔ پھر چین ہے جو اپنے حجم کے اعتبار سے سب سے زیادہ قابل توجہ ہے وہاں چہارسو پھیلی ہوئیں جمہوریت نواز تحریکوں سمیت۔ چینی راہنماؤں کا کہنا ہے کہ معاشی ترقی کو جمہوری رنگ کے پھیلنے سے قبل ہوجانا چاہیے۔ اور وہ جنوبی تائیوان اور دیگر ایشیائی ترقی یافتہ ممالک کے برعکس چین میں اپنی استبدانہ حکمرانی کے تحفظ میں حالیہ تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں۔ درحقیقت ان اقوام کا تجربہ ایک اور پیچیدہ سبق ذہن نشین کراتا ہے۔ سیاسی قوت پر مکمل دسترس رکھتے ہوئے معاشی ترقی کا ارتقاء جو نظم کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ خصوصاً" ایسی دنیا میں جس کا تجارت اور ابلاغ پر بڑھتا ہوا انحصار ہے جونہی لوگوں کی آمدن میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی نگاہ کا احاطہ وسیع ہوتا ہے تو اس امر کے امکان زیادہ ہیں کہ وہ حکومت میں شمولیت کا حق اور قانون کی حکمرانی کے اندر مکمل حفاظت چاہیں گے۔ جمہوریت کے حق میں تحاریک چلانا چاہیں گے جیسے ایک کا خاتمہ ٹیننان من سکوائر میں ۱۹۸۹ء میں خونی عمل سے قوانین پر عملدرآمد کرانے پر منتج ہوا۔ یہ تجویز کرتا ہے کہ چین کے شہروں میں رہنے والے لوگ اپنے راہنماؤں سے ایک ایسے جمہوریت کے ٹائم ٹیبل کے متمنی ہیں جو جمہوریت اور جو سیاسی آزادی کو پھیلائے۔

چین کی جانب ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پالیسی اس یقین کامل کی خبر دیتی ہے کہ مسلسل معاشی اور سماجی تعلق سب سے بہتر طریقہ ہے جمہوری رنگ کو پھیلانے کے عمل کے لئے۔ اس تجویز کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسانی حقوق کے ضمن میں چینی حکمرانوں کو آزادی دے دیگئی ہے لیکن اس کا مفہوم یہ تسلیم کرنا ہے کہ چینی جمہوریت میں کس حد تک آگے آچکے ہیں اور نسبتاً" ماضی قریب اور مستقبل کے بارے میں ایک وسیع نکتہ نظر رکھنا۔ کیونکہ قوتیں موجود ہیں جو سیاسی کنٹرول کے کھلنے سے خوفزدہ ہیں لیکن عام طور پر چینی آج ۱۹۷۰ء کی دہائی کے مقابلہ میں کافی آزاد ہیں یعنی جب سے چینیوں نے باہر کی دنیا کی طرف میل جول شروع کیا۔ کسی بھی وجہ سے یہ یقینی امر نہیں کہ آزادی کا رجحان مکمل جمہوریت پر جاکر ختم ہوگا لیکن متحرک امریکی تعلق کے بغیر ممکنات اور زیادہ خراب ہوں گے۔

مختصراً" یہ کہ چونکہ جمہوریت کا مستقبل زیادہ تر دنیا میں ابھی یقینی نہیں اور چونکہ اس کی بقا امریکی مفادات میں ہے۔ سو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو اپنے جمہوری ساتھیوں کے ہمراہ زیادہ محنت کرنی چاہیے ان کے انتہائی نازک دور کے دوران یعنی نوخیز جمہوریتوں کی امداد کے لئے۔ جو نسبتاً" مناسب ہو۔ بہت سے ممالک میں ہنوز جمہوری رنگ کے پروان کے لئے امریکی امداد ناگزیر ہے۔

امریکی اور غیر ملکی غیر حکومتی ادارہ جات کے ذریعے کلنٹن انتظامیہ نے حکومتی پروگرامز کی شراکت اور امداد مہیا کی یعنی تکنیکی امداد اور چناؤ کے انعقاد پر ادارہ جاتی تعمیر ۔ یہ بالخصوص ایشیاء فاؤنڈیشن کے قریبی تعلق سے ممکن ہوا جو ۱۹۵۶ء سے جمہوریت کے فروغ کے لئے کام کررہی ہے۔ ساتھ ساتھ نیشنل انڈومنٹ برائے جمہوریت جو ۱۹۸۴ء سے چہارسو اس ضمن میں متحرک ہے۔ جمہوری راہ سفر کے لئے امریکی امداد ناگزیر تھی ساؤتھ افریقہ کے ممالک سے لے کر نکاراگوا تک۔ نسبتاً" مناسب رقوم کا تعین کرنا بھی اکثر فیصلہ کن تفریق کا باعث بنا۔

لوگوں کو ایک موقع کی فراہمی

لیکن کبھی کبھار کچھ زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے جب جنوری ۱۹۹۳ء میں کلنٹن انتظامیہ نے اپنے عہدے سنبھالے تو ہیٹی (Haiti) ایک تیکھی للکار تھی۔ یہ ملک جو نہ صرف اپنے نصف کرہ میں بلکہ اقوام عالم کے مابین بھی غریب ترین تھا۔ اس ملک میں دسمبر ۱۹۹۰ء میں اپنی تاریخ کا سب سے آزاد اور شفاف چناؤ کا انعقاد ہوا۔ اہل رائے شماروں میں سے ۶۳ فیصدی نے ووٹ ڈالے اور Jean Bertrand Aristide کو صدارتی دوڑ میں ۶۷ فیصد ووٹ ڈالے گئے لیکن صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ نو ماہ بعد فوج اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے۔

نتیجے کے طور رونما ہونے والی آمریت کے تحت معیشت بکھر گئی اور بے رحمانہ جبرو تشدد نے ہزاروں مہاجرین کو سمندر کی جانب دھکیلا جہاں وہ لاغر کشتیوں کے ذریعے امریکہ کی طرف بھاگ نکلے۔ کلنٹن کی جمہوریت کے بقاء کی خواہش اور امریکی سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری نے مل کر فوجی طاقت کے استعمال کو حق بجانب قرار نہیں دیا۔ جولائی ۱۹۹۶ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سیکورٹی کونسل کو ترغیب دینے میں کامیاب ہوا کہ تمام ضروری ذرائع کے استعمال کو بروئے کار لایا جائے تاکہ بغاوت کے لیڈروں کو ہٹایا جائے اور صدارت کے عہدہ پر منتخب صدر کو بحال کیا جائے۔ یہ ایک عہد آفرین معرکہ تھا۔ پہلی دفعہ اقوام متحدہ نے بین الاقوامی عمل کو آواز دی کہ ایک جمہوری رنگ سے منتخب صدر کو بحال کیا جائے۔

تشکیک پسندوں کا خیال تھا کہ Aristide ایک دفعہ قوت میں آنے کے بعد اپنے آپ کو تاحیات صدر بنالے گا۔ درحقیقت وہ ایک آئینی تفویض شدہ شیڈول پر چناؤ کرانے کے لئے عمل پیرا ہوا اور اس سال فروری میں اس نے صدارت رونو پاغ وال کے سپرد کردی۔ ہیٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک جمہوری رنگ سے چناؤ شدہ راہنما پرامن طور سے دوسرے صدر سے صدارت کا عہدہ لینے میں کامیاب ہوا۔ غربت اور سیاسی تشدد کے تسلسل کے باوجود ہیٹی کی حکومت چل رہی ہے اپنی ان کوششوں کے ہمراہ کے معیشت میں اصلاحات کی جائیں اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جائے اور ملک کو مضبوط کیا جائے۔

کچھ سلسلوں میں بالکل ابتدا سے آغاز کیا جائے یعنی لوک سماج کے ادارہ جات کی تشکیل۔

روس اک اور بڑی آزمائش رہا ہے۔ حال ہی میں یعنی اس سال کے شروع سے تناظر اس سے زیادہ خنک مشکل سے ہی ہو سکتا تھا۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں کمیونسٹ بھاری اکثریت سے پارلیمنٹ کا چناؤ جیت چکے تھے۔ صدر بورس یلسن کی مقبولیت کا درجہ ۱۰ سے کم ہی تھا اور نمائندہ چناؤ اسے دیگر چار امیدواروں کے مقابل آنے والے دنوں میں پیچھے دکھا رہے تھے۔ بعد میں آنے والے دنوں میں مغرب کی رواجی حکمت اداس **پیشگوئیوں** کے درمیان آگے بڑھی اول یہ کہ **یلسن** الیکشن ہار جائے گا۔ دوئم یہ کہ وہ اسے منسوخ کردے گا اور پھر یہ کہ وہ اسے ناجائز ذرائع سے جیت لے گا مزید یہ کہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکے گا۔ یہ بھی کہ خواہ کوئی جیتے روس اپنی علاقائی جارحیت کی طرف لوٹ جائے گا۔

حقیقت پسند اپنی بھرپور طاقتوں سے نعرہ لگا رہے تھے۔ سابقہ وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو پریشانی لاحق ہوئی جیسا کہ ۱۹۳۰ء میں جرمنی نے کیا تھا۔ یعنی یہ بہت ممکن ہے کہ ایک چناؤ شدہ روسی قائد شاید انتہائی پریشان کن خارجہ پالیسی پیش کرے اور یہ سب کچھ اک نو ابھرتی جمہوریت کے لئے تجویز کرے۔ جہاں اکثر جارح خارجہ پالیسی پیش کی جاتی ہے۔ **کسنجر** اور دوسروں کی دلیل تھی کہ **کلنٹن** انتظامیہ کی توجہ روس میں صرف جمہوریت سازی کی طرف مرکوز نہیں رہنی چاہیے جو گمراہ کن ہے اور یہ کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو صرف روس کے غیر ملکی رویے کی جانب توجہ کرنی چاہیے۔ (۹)

غیر یقینی کے اس تمام لمبے عرصہ میں امریکی حکومت تیار تھی کسی بھی امر کے لئے۔ ہم نے تسلیم کیا کہ ایسے ملک میں جو خاص طور پر استبداد سے ابھر رہا ہے چناؤ خانہ جنگی یا معاشی بحران' پیدا کرسکتے ہیں ایسے وجیتا کے لئے جو جمہوریت کو منسوخ کردے اور نئے حاصل شدہ اختیارات کا غلط استعمال کرے اپنے مخالفین کو دبانے کے لئے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ ہٹلر نے ایک چناؤ کے نتیجہ میں نازی حاکمیت کو پیدا کیا اس کے باوجود امریکہ نے ہمیشہ روس میں چناؤ کے انعقاد کی حمایت جاری رکھی۔

جیسا کہ وہ چناؤ کے ضمن میں دوسری جگہوں پر کرتا ہے۔ اس اہلیت کے طریقہ ہائے کار کے تسلسل کو جاری رکھا جائے۔ شہریوں کی ضروریات کے مدنظر اور امریکی امداد کے حصول کی خاطر۔

ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بعد ہم اس یقین کامل پر قائم ہیں کہ روسیوں کو پہلا موقع ملنا چاہیے ان کی ریاست کی ہزار سالہ تاریخ میں کہ وہ اپنے قائدین کا انتخاب کرسکیں۔ روسی لوگ اس سوالوں کا جواب جس کا انہیں سامنا ہے کیسے دیں گے؟ اس بات کا صرف انہیں ہی حق ہے کسی اور کو نہیں۔ امریکہ کو روسی چناؤ میں ووٹ کا حق نہیں اور نہ ہی کسی کرسٹل بال کی ملکیت۔ لیکن امریکہ کو دلچسپی ہے ان پالیسیوں سے جو وجیتا آگے بڑھائے گا۔ امریکہ کے لئے یہ امر گہری دلچسپی کا باعث ہے کہ روس اس صدی

کے دوران زیادہ تر ایک کمیونسٹ آمریت تھا جس نے اپنے شہریوں پر جبرو تشدد قائم رکھا اور اپنے بہت سے ہمسایوں اور امریکی حلیفوں کو حراساں کیا۔ اس نکتہ نظر سے یہ امر امریکیوں کے لئے انتہائی اہم ہوگا کہ اکیسویں صدی میں روسی قائدین کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

راستہ ابھی تک غیر تعین شدہ ہے لیکن ان تمام کے باوجود روسی چناؤ ایک عارضی بریت ہے دونوں یعنی روسی جمہوریت سازی اور اس سلسلہ میں امریکی امداد کے لئے۔ ۳ جولائی کو ۷۲ ملین شہریوں سے زائد یعنی اہل رائے دہندگان کے ۶۷ فیصد نے ۹۶۰۰۰ چناؤ منڈلوں پر جو ۱۱ وقت کے زاویوں میں منقسم تھے ووٹ ڈالے۔ یہ اعداد و شمار قریباً" اتنے ہی اہم تھے جتنا یلٹسن کی جیت کے ۱۴ پوائنٹ (۱۰)

چناؤ نے کچھ یقین دہانی مہیا کی روسی خارجہ پالیسی کے خطوط کی جانب۔ مارچ میں پارلیمانی خوش مزاجی کے برے شگون کے ساتھ کمیونسٹوں نے دباؤ ڈالا سوویت یونین کی تعمیر نو کے لئے۔ کمیونسٹوں کا اس حقیقی چہرے کے اظہار نے روسی رائے دہندگان میں غیر متوقع نتائج پیدا کئے۔ انہوں نے گھریلو اخراجات کی زیادہ فکر کی اور اس وجہ سے یلٹسن کی غیر معمولی فتح ممکن ہو سکی۔ صاحب انصاف اب بھی منتظر ہے دیکھنے اور جاننے کے لئے کہ اگلی صدی میں روس کیسی ریاست ہوگی؟ لیکن کمیونسٹوں کے رجوعی پروگرام کو رد کر کے روسی لوگوں نے کم از کم جزوی طور پر ڈاکٹر کسنجر کے خوف کو ابتدائی طور پر رد کردیا کہ روسی جمہوریت ضروری طور پر روسی پھیلاؤ کو چھپائے گی (۱۱)

ایک اور تازہ جمہوریت کی آزمائش' ۱۴ ستمبر کو بوسنیا میں رائے دہندگی کا دور تھا۔ بہت سے نظر بینوں نے ان چناؤ کے شیڈول پر انعقاد کی مخالفت کی تھی کیونکہ ملک میں آزادی سفر پر وسیع و عریض پابندیاں موجود تھیں۔ کلنٹن انتظامیہ بہرحال یہ یقین رکھتی تھی کہ ان کا انعقاد ضروری ہے۔ التوا نے مزید رکاوٹیں کھڑا کردینی تھیں اک مرکزی حکومت کے قیام کے لئے اور ان اداروں کے لئے جو وضع کئے گئے ڈے ٹن (Day ton) کے معاہدہ جات امن میں یعنی اک مشترکہ صدارت قومی اسمبلی' قومی آئین اور عدالتی عہدہ داران۔ بوسنیا کی نسلی اقوام کے مابین بتدریج ہم آہنگی اور باہمی رجعت کے لئے یہ سب مرکزی نکتہ تھے۔

التوا ان سیاسی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کرے گا جو اپنی نسل پرست اقوام کی نمائندگی کررہی تھیں اس یقین کے ساتھ کہ وہ دوسرے اہم نکتہ یعنی وقت مقررہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ وہ جو جمہوری حکمرانی کی طرف بڑھنے کے لیے مخلص نہیں تھے۔ (۱۲)

اور جب بالاخر وہ رائے ڈالنے کے قابل ہوئے ۱۲۰۰ بین الاقوامی چناؤ سپروائزر اور دیگر کی چوکس نگاہوں کے سامنے تو اہل بوسنیا کا ایک خاصا بڑا طبقہ رائے دہندگی کے لیے گیا۔ اگر جمہوریت سازی کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر موقع ملے اور بالخصوص اگر نیا موقع ملے تو لوگ رائے دینا پسند کرتے ہیں' وہ اس

موقع کو انتہائی اہم سمجھتے ہیں اپنے ملک کے نظام میں اپنی رائے ڈالنے کے لیے۔ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۵ء میں یہ ہیٹی سے حاصل شدہ سبق ہے۔ ۱۹۹۳ء میں کمبوڈیا اور جولائی ۹۶ء میں روس اور بوسنیا نے بھی اس امر کا پھر اعادہ کیا۔

یہ چار مقدمہ جات بیان کرتے ہیں ایک زیادہ تاریک نکتہ' گو چناؤ ضروری ہیں لیکن وہ بذات خود ناکافی ہیں اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کہ جمہوریت قومی زندگی کی ایک مستقل ضرورت بن جاتی ہے اگر چناؤ ان سیاستدانوں کا ذریعہ بن جائے جو علیحدگی پسندی یا مکمل نسل پرستی کے جذبات بھڑکاتے ہیں تو وہ سماج میں تقسیم کے عمل میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اسے بے نقاب کرسکتے ہیں۔ لیکن ان علاقوں میں بھی جہاں نسل پرست جماعتیں کامیاب ہوتی ہیں' مثلاً جیسے بلکان۔ جمہوری طریقہ کار ہی بہرحال بہتر ہے کسی بھی دیگر متبادل کے مقابل۔ اگر قائدین کو بیلٹ بکس کے ذریعے پسندیدہ رائے کے ساتھ چناؤ کا موقع نہیں دیا جاتا تو پھر وہ راغب ہو سکتے ہیں دوبارہ ہتھیاروں کی جانب' جیسا کہ ایچ ایل مینکن نے اپنے ایک ضعف معدہ سے متعلقہ مضمون میں کہا کہ "جمہوریت کی برائیوں کا علاج اور زیادہ جموریت ہے۔" (۱۳)

اس کام کی نشوونما

اضافی جمہوریت سے مراد پہلے لوگوں کو صرف آزادانہ رائے دینے کا حق دار بنانا ہے لیکن معاملہ اس سے آگے ہے کسی ملک کی بیماری کو دور کرنے کے لیے چناؤ علاج کا اہم حصہ ہیں لیکن یہ کوئی راتوں رات ٹھیک کر دینے والا تجویز شدہ نسخہ نہیں۔ کوئی بھی سماج اپنے انداز حکمرانی سے فوری طور اور آسانی سے دستبردار نہیں ہوتا۔ برلن کی تقسیم دیوار یا مرکزی ماسکو میں نصب FELIX D ZERZHIN SKY کی یادگار قائم کرنا بہت آسان ہے۔ بہ نسبت ان اداروں کی تعمیر جیسے غیر سیاسی پولیس اور آزاد عدلیہ۔ ساختی اصطلاحات اگر بنیاد پکڑ لیں تو ان کے مساوی لوگوں کے رویوں میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگی یعنی جسے کبھی کبھار سیاسی سماج کا نام دیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں شائع شدہ اپنی کتاب بعنوان

"PERICLES OF ATHENS AND THE BIRTH OF DEMOCRACY" میں Yale یونیورسٹی کے کلاسیکی ادب کے پروفیسر ڈونلڈ کاغان نے ایک اصول واضح کیا جو آج بھی اتنا ہی قابل عمل ہے جتنا ۲۵۰۰ سال قبل تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جمہوری انداز حکومت کی بنیاد تین شرائط پر ہے۔ پہلا یہ کہ اچھے ادارہ جات کے مجموعہ کی موجودگی' دوسرا یہ کہ جمہوریت کے اصولوں کا فہم رکھنے والی شہریوں کی جماعت یا ایسی جماعت کی موجودگی جو جمہوری انداز سے مطابقت رکھنے والی خصوصیات رکھتی ہو۔ اور تیسرا یہ کہ کم از کم بحرانی لمحات میں اعلیٰ درجہ کی قیادت کی موجودگی۔ ان تمام کے حصول کے لیے وقت چاہیے۔ صرف سال نہیں بلکہ دہائیاں یا ایک سے زیادہ نسلوں کا سامنا۔

جیسا کہ یلسن کا سابق مشیر اور ازاں بعد ناقد اور انسانی حقوق کا علمبردار SERGEI KOVOLYOV روسی چناؤ کے ضمن میں کہتا ہے۔ "جمہوریت کی استعداد بڑے پیانے پر جمہوریت نوازوں کی استعداد پر منحصر ہے۔ ہمیں منتظر رہنا چاہئے۔ فشارات اور جمہوری اصولوں کے ہمراہ عوامی فشارات کا۔ اس کے بغیر سب کچھ پہلے جیسا ہی رہے گا اور یہ وقفہ وقفہ سے غیر یکساں طور پر جاری رہے گا۔ پچھلے سال کے ہنگاموں اور غیظ و غضب کو دیکھتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچا : اب ہمارا رومان پرور جمہوری دور بیت چکا ہے اور بالاخر ہمیں حقیقتوں کا سامنا ہے۔(۱۴)

روس اور دیگر جگہوں پر جمہوریت نوازوں کے لیے امریکہ کا یہ جواب ہونا چاہیے : ہم اپنے جانے پہچانے سیاسی میدان یعنی جمہوریت کے اندر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ راستہ کی تلاش اور اس کے نشیب و فراز میں آپ ہمیں اپنا ہم راہی پائیں گے۔ اس وقت تک جب تک آپ صحیح منزل کی جانب گامزن نہ ہو جائیں۔ امریکہ کے ذاتی تجربے کے پیش نظر استعاریت سے جمہوریت کے درمیانی عرصہ میں صابر' مستقل مزاج اور باادب ہونا چاہیے۔ ان کے ہمراہ جو راہ سفر میں نوادرد ہیں۔ ۱۷۷۶ء میں جب امریکہ آزاد ہو تو نئی ریاست کو آئین کی تعمیر میں ۱۱ سال لگ گئے۔ ۸۹ سال غلامی ختم کرنے میں' ۱۴۴ سال عورتوں کو ووٹ دینے میں' ۱۸۸ سال لوگوں کو مکمل آئینی تحفظ فراہم کرنے میں اور اس دوران ۸۷ سال بعد ہم خانہ جنگی کا شکار ہوئے۔

۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو امریکی رائے دہندگان رائے شماری کے لیے جائیں گے ۵۳ ویں صدر اور ۱۰۵ ویں کانگریس کو چننے کے لیے۔ ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ جمہوریت ہنوز اپنی پیدائش اور فروغ کے لیے نمو کی خواہش مند ہے مگر قیادت کے لیے دنیا ابھی تک امریکا کی جانب نظریں اٹھائے ہوئے ہے یہ سب کچھ ہماری معاشی اور فوجی قوت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے بھی ہے کہ ہم اپنے راہ سفر میں سب سے بہتر مقام پر ہیں۔ غیر ممالک میں ان سیاسی اصولوں کے تشہیر اور دفاع میں ہمارا گریبان داغ دار نہیں ہے۔ بین الاقوامی قیادت کے لیے امریکی شہریوں کی امداد کا تسلسل رکھنے کے لیے امریکی خارجہ حکمت عملی ریاست کے مفادات کے مطابق ڈھلنی چاہیے۔ ایک پھیلتی ہوئی جمہوری دنیا میں ہی امریکی شہری اپنے آپ کو صحیح طور پر محفوظ خیال کرے گے۔

حواشی

1 مثال کے طور پر ملاحظہ کریں مائیکل منڈل بام کا مضمون "خارجہ حکمت عملی اور سماجی کام" مطبوعہ فارن افیئرز۔ جنوری / فروری 1996ء صفحہ 16 تا 32 اور ہنری کسنجر کا مضمون "ہوشیار! ایک بیرونی خطرہ" مطبوعہ نیوز ویک جون 17 1996ء صفحہ 42

2 یہ اصول بیسویں صدی کے امریکی سیاست دانوں کے خیالات میں ممتاز رہا ہے۔ وڈرو ولسن نے جمہوریت کے بارے میں کہا تھا۔ "یہ ریشہ دوانیواں' حسد اور شکوک جنہیں جنگ پیدا کرتی ہے' ان کا

بہترین تدارک ہے۔" اور فرینکلن روز ویلٹ نے کہا تھا۔ "جمہوریت کی مسلسل بقا اور اس کی بہتری' بین الاقوامی امن کی سب سے بہترین ضمانت ہے۔" مشاہداتی شہادت کا خاصہ بڑا حصہ اور علم سیاسات کی دانش اس قول کی حمایت کرتی ہیں کہ جمہوریاؤں کے مابین لڑائی کے مواقع کم آتے ہیں اور زیادہ مواقع اس بات کے ہیں کہ وہ استبدانہ ریاست کے خلاف جنگ جیتتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کریں ڈیوڈ الیک کی تحریر! طاقت ور امن کا علمبردار "جنگ اور جمہوری ریاستیں" مطبوعہ امریکن پولٹیکل سائنس ویویو 1992ء صفحہ 24 تا 37۔ اس دلیل کی حمایت کے لیے جمہوریتیں بہتر بین الاقوامی ساتھی ہیں۔ ملاحظہ کریں جی جون ایکن میری کی تحریر۔ "سرد جنگ کے بعد بحران کی داستان" مطبوعہ فارن افیئرز۔ مئی/جون 1996ء صفحہ 79 تا 91۔ بہرحال اس بات پر کہ آیا جمہوری ممالک غیر جمہوری ممالک کے مقابلہ جنگ میں کم یا زیادہ شرکت کرتے ہیں' کے موقع پر کثیر مباحث موجود ہیں۔ اس مسئلے کا مکمل گہرائی سے احاطہ کیا گیا ہے کہ انٹرنیشنل سیکورٹی کے عنوان کے تحت۔ مثلاً" ملاحظہ کریں' کرسٹوفر لین کانٹ کی تحریر "جمہوری امن کی داستان" مطبوعہ فال شمارہ انٹرنیشنل سیکوریٹی 1994ء صفحہ 5 تا 49 اور ایڈورڈ میر فیلڈ اور جیک سینڈر کی تحریر " جمہوری رنگ سازی اور جنگ کے خطرات" انٹرنیشنل سیکورٹی ثمر 1995ء صفحہ 5 تا 38

(3) شہری آزادیوں اور سیاسی حقوق کے ضمن میں فریڈم ہاؤس کا حالیہ سروے نے ثابت کیا ہے کہ 1995ء کے دوران تعطل "انقلابی انتشار کی سیاست" جو سماج کو عام طور پر آزاد کر دیتی ہے' ایسے سماج کو جو جمہوری حاکمیت کا خاصہ رکھتے ہیں اور جو استبدانہ حکمرانی کرتے ہیں' ملاحظہ کریں۔ آرڈیان کارائینا ٹیکی کی تحریر "جمہوریت اور استبدادیت۔" فریڈم ریویو' جنوری' فروری 1996ء۔

(4) چہارسو جمہوریت کے پھیلاؤ کی سیموئیل پی ہنٹنگٹن یوں تصویر کشی کرتا ہے۔ "تین لہروں میں سے سب سے حالیہ جمہوریت نوازی کی لہر ہے جس نے جدید دنیا کی تعمیر کی ہے۔ پہلی لہر 1828ء سے 1926ء تک زندہ رہی اور دوسری 1934ء سے 1964ء تک ملاحظہ کریں۔ "تیسری لہر۔ بیسیویں صدی کے اواخر میں جمہوریت سازی" مطبوعہ اوکلاہاما پریس 1991ء

Benin کے سابقہ صدر Nicephore Solgo نے مارچ میں ہوئے چناؤ میں اپنی شکست کے بعد تحریر کیا کہ بہت سے افریقی قائدین نے آزادی کے بعد ابتدائی دنوں میں اپنی استبدانہ حکمرانی کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے' دعویٰ کرتے ہوئے کہ وہ روشن خیال آمر تھے۔ ہم ہمیشہ ان کی میراث یعنی معاشی بربادی اور سیاسی تشدد کے سائے میں زندہ رہے۔ افریقہ اپنے لیے دنیا سے مختلف معیارات نہیں تراش سکتا۔ اگرچہ وہ صدر Mathieu Kevekou کے مقابل صدارات کا چناؤ ہار چکا تھا لیکن اس نے نتائج کو جمہوریت کی فتح قرار دیا اور یاد دلایا کہ 80 فیصد رائے دہندگان نے رائے شماری میں حصہ لیا۔ موجودہ صدر سے قبل 1972ء میں فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار میں آئے تھے۔ Solgo کا کہنا تھا کہ اس سال یہ رائے شماری کے نتیجہ میں ہوا۔ "میں ایک افریقی چناؤ ہار گیا ہوں لیکن جمہوریت جیت رہی ہے۔ ملاحظہ کریں "واشنگٹن پوسٹ" 12 اگست 1996ء

(6) ملاحظہ کریں ہنٹنگٹن - "طویل جمہوریت" مطبوعہ جرنل آف ڈیموکریسی اپریل 1996ء Olson Mancur "آمریت، جمہوریت اور ترقی" امریکن پولٹیکل سائنس ریویو 1993ء

(7) ملاحظہ کریں سین : "آزادیاں اور ضروریات۔ سیاسی حقوق کی اہمیت کے بارے ایک دلیل" دی نیوری پبلک، 10 جنوری 1996ء صفحہ 34 تا 35

(8) ملاحظہ کریں لیری ڈائمنڈ! "لاطینی امریکا میں جمہوریت، درجات پرفریبان اور آہنگی کی سمتیں۔ ٹام فیرر کی ادارت میں۔" اقتدار اعلیٰ سے بعید! مشترکہ طور جمہوریت کا دفاع مقتدر ریاستوں کی دنیا میں: بالٹی مور جان ہاکنز پریس، 1996ء: دنیا میں جمہوریت اور آزادی کے سروے میں۔ قصر آزادی دنیا کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شہری آزادیوں اور سیاسی حقوق کی بنیاد پر یعنی <آزاد>، <نصف آزاد" اور مقید۔ نصف آزاد ملکوں نے کافی حد تک سیاسی قوت یا شہری آزادیوں یا دونوں کو اپنے شہریوں کے لیے پھیلا دیا ہے لیکن آزاد جمہوری ملک جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مقابلہ میں ابھی کمتر ہیں۔ 1996ء کا سروے مثلاً سری لنکا، کولمبیا، ال سلوا ڈور اور گوئٹے مالا کو نصف آزاد جمہوریتیں تصور کرتا ہے۔

9 - ملاحظہ کریں ہنری کسنجر کی تحریر : "ماسکو اور بیجنگ! آزادی کا ایک اعلان" 14 مئی کا "واشنگٹن پوسٹ" صفحہ A15

10 - 16 جون کو پہلے راؤنڈ میں 70 فیصد روسیوں کے ووٹ ڈالنے کے بعد رائے دہندگان کی تعداد خصوصی طور پر متاثر کن تھی۔

11 - وہ اس دلیل کا پراثر جواب کہ روس طبیعتاً" اور لاعلاج طور پر پھیلاؤ کا حامی ہے اور روسی جمہوریت اس آگ کو ہوا دے گی۔ ملاحظہ کریں Stephen Sestanorich کا مضمون جغرافیائی مالش : اپنا اور روس کا دماغی معائنہ : نیشنل انٹریسٹ : فال 1996ء

12 - بین الاقوامی بحران گروپ جس نے چناؤ کا مشاہدہ کیا، ان کا سخت استدلال چناؤ کے انعقاد کا التوا کرنا تھا جیسا کہ کئی دوسرے اخباری مشاہدین کا بھی خیال تھا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں۔ "کلنٹن کا ڈے ٹن معاہدہ" "وال اسٹریٹ جرنل" 28 اگست 1996ء صفحہ A-12- اگست میں عبوری الیکشن کمیشن کے چیئرمین رابرٹ فرووک، جو یورپی سلامتی کمیشن کے اعلیٰ نمائندہ بھی تھے، انہوں نے بوسنیا کے میونسپل الیکشن کو منسوخ کر دیا۔ سربوں کی واضح کوششوں کی روشنی میں غلط رجسٹریشن کروا کر چناؤ کو الگ کیا جائے۔ ان کے اس عمل نے عالمی برادری کے مضبوط ارادے کا احیاء کیا جس کی وجہ سے متحارب فریقین بعد میں درست عمل کی جانب متوجہ ہوئے۔

13 - Reinbold Neibur بھی اسی نکتے پر بحث کرتا ہے کہ انسان کی نیک خواہشات جمہوریت کو ممکن بناتی ہیں اور اس کی ناانصافی کی خواہش جمہوریت کو ضروری بناتی ہے۔

14 - کریملن کے لئے جنگ : روس سے خط : تحریر David Remnic مطبوعہ : دی نیو یارک 22 جولائی 1996ء صفحہ 57

ترجمے کے مسائل

★ ——————— بلراج کومل (بھارت)

پچھلے دو تین برسوں میں جب میں کنڑا زبان کے مشہور ناول نگار راجہ راؤ کے ناول "THE SERPENT AND THE ROPE" (دی سرپینٹ اینڈ دی روپ) کا اُردو ترجمہ کرنے میں مختلف قسم کی مشکلات سے نبرد آزما تھا تو فرصت کے لمحوں میں اکثر میں اپنے ذہن میں ان مسائل کی تفصیل دہرایا کرتا تھا جو کام کرتے ہوئے اُبھر کر میرے سامنے آئے تھے اور جن کا حل میں نے اپنی صوابدید کے مطابق، یا دوستوں کے مشورے سے کسی نہ کسی طرح تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ترجمہ بظاہر اگرچہ انگریزی سے اُردو میں تھا لیکن عملی صورتِ حال یہ تھی کہ میرا واسطہ بیک وقت کئی زبانوں سے آپڑا تھا جن میں سنسکرت، فرانسیسی اور دو ایک یورپی زبانیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن سے متعلق ادبی، تاریخی اور دیگر متفرق حوالے اس ناول میں موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کوئی شخص بہ حدِ مقدور کتنی زبانیں سیکھ سکتا ہے اور ان پر عبور حاصل کر سکتا ہے — میں گینیس بک آف ریکارڈز میں اندراج کا اعزاز پانے والے پولی گلوٹس (POLYGLOTS) کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا لیکن میرے عملی تجربے اور مشاہدے کے مطابق ایک سے زیادہ زبانوں میں ایک محدود دائرے کے اندر بات چیت کرنے، تھوڑا بہت لکھنے لکھانے اور کچھ معمولی نوعیت کا کام کرنے کی تربیت تو حاصل کی جا سکتی ہے لیکن مکمل لسانی دسترس مہارت اور قدرت صرف چند زبانوں کی حد تک ہی ممکن ہے۔ ترجمے کے تعلق سے جہاں ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور کرنا ایک مسئلہ ہے وہیں یہ کارِ مشکل ترجمے کا جواز بھی ہے۔ تمام مشکلات اور مسائل کے باوجود ترجمہ ہی وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم دوسری ملکی، بین الملکی اور بین الاقوامی زبانوں کے علم و ادب تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم دو تین چار یا آپس میں قریبی تعلق رکھنے والی اس محدود تعداد سے کچھ زیادہ زبانیں جانتے ہیں تو کیا کہنے لیکن اگر ہم وہ دو زبانیں بھی اچھی طرح جانتے ہیں جن کا ہمارے مخصوص ترجمے سے تعلق ہے تو آغازِ سفر میں کوئی دشواری نہیں۔ اصل مراحل سے سامنا تو آغازِ سفر کے بعد ہی ہوتا ہے۔

ترجمے کے کچھ مسائل ایسے ہیں جن کی نوعیت تمام زبانوں کے حوالے سے مشترکہ خصوصیات کی حامل ہے۔ ہر عہد اور ہر مصنف کا مخصوص، منفرد لب و لہجہ، منفرد اسلوبِ اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر عہد اور ہر مترجم کا مخصوص، منفرد لب و لہجہ منفرد اسلوبِ اظہار ہوتا ہے۔ اگر مصنف اور مترجم دونوں ایک ہی دور اور عہد سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں باہمی ترسیلی رابطہ عصری

عناصر کی کارکردگی کے باعث ان مصنفین اور مترجمین کے امکانی رابطے کی نسبت آسان ہوگا جو مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترجمے کی کامیابی کا انحصار بہرحال مترجم کی متعلقہ زبانوں کی لسانی خصوصیات، متعلقہ عہد کی انفرادیت، رائج الوقت لفظیات اور اسالیب اظہار سے ماہرانہ واقفیت پر ہوگا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اس کی نجی استعداد اور صلاحیت پر جو خداداد ہو یا نہ ہو، بہرحال تربیت اور محنت سے قابل اعتبار سطح پر بروئے کار لائی جاسکتی ہے۔

یونانی شاعر ہومر کی ILIAD (ایلیڈ) کے مترجمین میں ۱۵۹۸ء میں جارج چیپ مین سے لے کر دور حاضر تک جو ادیب اور شاعر سرگرم عمل رہے ان میں جان ڈرائڈن (۱۶۹۳ء) الیگزینڈر پوپ (۱۷۱۵ء) ولیم کاوپر (۱۷۹۱ء) لینگ الیف مائرنر (۱۸۸۳ء)، اے۔ ٹی۔ مرے (۱۹۲۴ء)، ای۔ وی۔ ری یو (۱۹۵۰ء)، آئی اے۔ رچرڈز (۱۹۵۰ء)، رچمونڈ لٹی مور (۱۹۵۱ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب لوگوں نے ہومر کے لفظ کو اس کی لسانی خصوصیات، متعلقہ عہد کی انفرادیت اور تہ در تہ معانی کی دریافت کے تعلق سے پہچاننے کے علاوہ اسے نئے قالب میں ڈھالنے کے لئے جس صلاحیت کا استعمال کیا وہ سراسر ان کی انفرادی صلاحیت تھی اور اسلوب و اظہار کے ان کے اپنے عصری اسلوب اور محاورے میں اپنی راہ تلاش کرنے کی کفیل تھی۔

تحریر نثری ہو یا شعری کچھ دیگر مسائل بھی تمام زبانوں کے تعلق سے کم و بیش مشترک ہیں۔ وہ نثری تحریریں جو اطلاعاتی، معلوماتی یا سائنسی نوعیت کی ہیں، کسی جذباتی انحرافی بے راہ روی یا ژولیدگی کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ ترجمے میں تفصیل کی پیش کش، جملوں کی نشست و برخاست اور ترتیب و تنظیم کا شفاف، براہ راست اور با ترسیل ہونا ضروری ہے بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنانا ضروری ہے کہ ترجمے کے عمل میں شامل متن اطلاعات، اصطلاحات اور معلومات میں نہ تو اغلاط در آئیں اور نہ ہی ان کی صحت پر کوئی حرف آئے۔ علمی اور فلسفیانہ تحریروں کے ترجمے میں ترجمے کی زبان کا لفظیات اور اصطلاحات کی بارگراں سے گریز بعض اوقات مشکل ہوتا ہے۔

وہ نثری تحریریں جو فکشن، ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے ذیل میں آتی ہیں، ترجمے کے عمل میں اطلاعاتی نثر اور شاعری سے نبٹنے کے رویوں کے بیچ کے رویے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ تحریر کے وہ حصے جو سادہ بیانیہ کی صورت میں ہوتے ہیں کوئی خاص مشکل پیدا نہیں کرتے ہیں البتہ وہ حصے جو نثری ہوتے ہوئے بھی شعری نوعیتیں اختیار کرلیتے ہیں۔ ایک سے زیادہ معانی سے سرفراز ہوجاتے ہیں، انتخاب مفہوم کی ترجیحی صورتوں کے باعث بہت سی مشکلیں پیدا کردیتے ہیں۔ شاعری کے تعلق سے تو یہ مسئلہ بہرحال ناگزیر ہے لیکن تخلیقی نثر کی بعض صورتوں میں بھی اس سے فرار ممکن نہیں۔ مترجم جس ترجیحی مفہوم کو ترجمہ شدہ متن میں منتقل کرتا ہے اس کا قابل اعتبار ہونا اور دور از کار ہونے کے خطرے سے بچنا بہرحال ضروری ہے۔

شاعری کے ترجمے کے بھی کچھ مسائل سب زبانوں میں مشترک ہیں۔ استعارہ، علامت، امیج، پیکر، کثیر الجہت جدلیاتی لفظ شعر میں ایک ایسے جہان معانی کو جنم دیتے ہیں جس کے آفاق تک رسائی ہر قاری اپنی بساط اور مقدور کی حدود کے اندر کرتا ہے۔ مترجم بھی اپنی ترسیلی، تفہیمی، بساط اور مقدور کا اسیر ہے۔ وہ ناگزیر طور پر اپنی بساط کے مطابق انتخاب معنی و مفہوم کرتا ہے اور پھر اسے ترجمے کے ذریعے دوسری زبان کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ ہر زبان کا چونکہ اپنا منفرد لب و لہجہ اور آہنگ ہے اس لئے اصل زبان کے آہنگ کے پیمانے اور ترجمے کی زبان کے آہنگ کے پیمانے کسی صورت

میں ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں۔ ترجمے کی زبان میں مترجم کو آہنگ کی وہ کیفیت خلق کرنا ہوتی ہے جو اصل زبان کے آہنگ کی دلآویزی اور موسیقی کو بہتر سے بہتر تناسب میں کامیابی سے حاصلِ ترجمہ متن میں منتقل کر سکے۔

ڈرامے کے ترجمے میں نثری ٹکڑے کوئی خاص مشکل پیدا نہیں کرتے۔ ڈرامے میں ترجمے کا اصل مسئلہ مکالمے اور گفتگو کے ترجمے کا مسئلہ ہے۔ ہر اچھا ڈرامہ نگار ہر کردار کی مخصوص شخصیت اور منفرد خصوصیات کے اعتبار سے مکالمے لکھتا ہے۔ وہ کردار مرد، عورت، بچہ مخصوص فرقے، حلقے، نشے سے تعلق رکھنے والا فرد یا کوئی تخیلی موجودگی ہو سکتا ہے۔ اگر اصل متن میں مکالمہ کرداروں کے تعلق سے منفرد نوعیتوں کا حامل ہے تو ترجمے کی زبان میں بھی ان منفرد نوعیتوں کا منتقل ہونا ضروری ہے۔

ترجمے کے ان مسائل کے علاوہ جو سب زبانوں کے لئے مشترک ہیں کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو اُردو زبان کے تعلق سے مخصوص ہیں اُردو زبان کا دیگر زبانوں کی طرح ایک اپنا منفرد مزاج ہے۔ اُردو زبان میں دیگر زبانوں کی تحریروں کے تراجم کے الگ مسائل ہیں اور اُردو زبان کی تحریروں کے دیگر زبانوں میں تراجم کے الگ۔ اُردو زبان کا مزاج دیگر مشرقی زبانوں کی طرح یورپی زبانوں خاص طور انگریزی زبان کے مقابلے میں بات کو آرائشی لوازمات سے کچھ بڑھا چڑھا کر کہنے کا انداز ہے۔ اس لئے جب دیگر زبانوں کی شاعری کا اُردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو اُردو زبان کے مترجمین نادانستہ انداز میں مبالغہ اور اضافہ کا اہتمام کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف جب دیگر زبانوں کے مترجم اُردو زبان کے حاوی مزاج کے زیر اثر ترجمے کی زبان کی غیر ضروری آرائشی لیپا پوتی کر کے اسے مصنوعی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ غالبؔ اور فیضؔ کی شاعری کے کچھ انگریزی تراجم اس رویے کی مثال ہیں۔

اُردو زبان میں صحافتی، عمومی، اطلاعاتی تحریروں کے ترجمے کا کام تو کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہتا ہے۔ لیکن سائنسی تحریروں کے ترجمے کے سلسلے میں مزید کام اور محنت کی ضرورت ہے۔

دارالترجمہ حیدرآباد، ترقی اُردو بورڈ، ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور دیگر ہندوستانی اور پاکستانی سرکاری اور اور غیر سرکاری اکادمیوں اور اداروں کی کوششوں سے صورتِ حال اگرچہ کافی حد تک پہلے سے بہتر ہو گئی ہے لیکن لغت سازی میں متبادل الفاظ کا تھیسارس (THESAURUS) تیار کرنے میں اور اصطلاحات وضع کرنے اور مرتب کرنے میں یا تو قابلِ اعتبار معیار کی سطح فی الحال، حاصل نہیں ہوئی یا پھر اس کام کا آغاز ہی نہیں کیا گیا۔

ترجمے کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوال ترجمے کا طریق کار طے کرتا ہے۔ یورپ کے ناشر جب دیگر زبانوں کی تحریروں کے تراجم چھاپتے ہیں تو ان کے سامنے ایک طے شدہ مقصد ہوتا ہے۔ معلوماتی اور اطلاعاتی تحریروں کے تراجم شائع کرتے وقت وہ ان کے معیار اور متن کی صحتِ لفظ و معانی کو یقینی بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ تخلیقی ادب کے تراجم میں وہ مختلف اصنافِ سخن میں مطلوبہ طریقِ کار کا سہارا لیتے ہیں، ناول، افسانہ، ڈرامہ کے تراجم میں چونکہ مخصوص ماحول، مخصوص کرداروں کی حرکات و سکنات، واقعات، مکالمات، صورتِ احوال کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا مقصود ہوتا ہے اس

لئے وہ ضمنی تفصیلات میں اُلجھے بغیر منزلِ مقصود پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاعری کے تراجم میں جن میں رسمی آہنگ کی صورتیں وضع کر کے اصل متن کے آہنگ کی دلآویزی کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے دوسری قسم کے وہ تراجم ہیں جن میں شعری متن کا صرف نثری ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان تراجم کا مقصد متوقع قاری کے لئے مہمیز کا کام کرنا ہوتا ہے۔ محدود ترسیل کے بعد اگر قاری کے اندر سیرابیٔ ذوق کے لئے مزید تجسس پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بعض اوقات امکاناً اصل زبان کو سیکھنے کی کوشش کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اُردو زبان کو محدود وسائل کے باوجود ان سب امکانات کو سمجھنا اور ان کو عملی روپ دینا ضروری ہے۔

ترجمے کا کام بظاہر ایک میکانکی قسم کا کام ہے۔ ترجمہ خاص طور تخلیقی ترجمہ اگر منزلِ تکمیل پر صرف میکانکی قسم کا اہتمام یا محض الفاظ کا ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے تو وہ مترجم اور قاری دونوں کے لئے تضیع اوقات کے مترادف ہے۔ اصولوں کی پاسداری نظم وضبط اور قوانین کا احترام مسلّم لیکن اگر ترجمہ جیتی جاگتی دھڑکتی ہوئی زندہ تخلیق میں نہیں ڈھلتا تو جواز سے محروم ہو جاتا ہے۔ قابل مترجم کی استعداد خدا داد ہے یا اکتسابی، یہ متنازعہ فی مسئلہ ہے لیکن اگر کسی ترجمہ شدہ تحریر کو پڑھ کر قاری اپنے آپ کو فکری اور جذباتی طور پر سرگرم اور متحرک محسوس نہیں کرتا تو وہ تحریر محض مجموعۂ الفاظ ہے۔ فعال تحریر ہرگز نہیں ہے۔

لورکا نے شاعری کے ایک منفرد، پُراسرار، تحرک انگیز وصف DUENDE (دوانیدے) کا ذکر کیا تھا۔ اس کے نزدیک شاعری کا یہ وصف اس 'لہو کی آواز' کی طرح ہے جو تمام اصولوں، تمام قوانین اور ہر قسم کے نظم وضبط کے باوجود لمحۂ انکشاف میں بے اختیارانہ اُبھرتی ہے اور سارے ماحول پر چھا جاتی ہے۔ مَیں لورکا کے حوالے سے شاعری کے اس وصف کا ذکر کرتا ہوں۔ آج میں ترجمے کے تعلق سے لورکا کے اس وصف کا ذکر دہراتا ہوں جس طرح شاعری اس وصف کے بغیر بے جان ہو کر رہ جاتی ہے اسی طرح ترجمہ بھی اس کے بغیر زندہ اور متحرک نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں مترجم بھی کسی نہ کسی سطح پر تخلیق کار کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

منفرد لہجے کے باوقار شاعر شاہین بدر کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب

"زرد موسم کی ہوا"

پیش کش : فکشن گروپ — ۶۶ ۔ نور پلازہ ۔ بلاک ایم ، شمالی ناظم آباد ۔ کراچی نمبر ۷۴۷۰۰

احمد ظفر

آذرِ وقت کے نام

میں نمائش گہِ ہستی میں کسی آذر سے
بُت خریدوں تو خریدوں کیسے
بُت جو خاموش ہیں،
جو بات نہیں کرتے ہیں
نہ کسی سر سے سَرکتا ہُوا آنچل دیکھوں
نہ کسی آنکھ سے بہتا ہُوا کاجل دیکھوں
نہ کسی پھول کی پتی کی طرح بہتے ہیں
نہ کسی ہجر کے گوشے ہیں،
یہ در پردہ کبھی سلتے ہیں

میں نے مانا کہ پرستش میری عادت ہے مگر
رنگ میں لپٹے ہوتے سنگ جو دیکھوں
تو خریدار بنوں میں کیسے ؟
اس کی آنکھوں میں جو اقرار نہیں
اِس کے لب پر کوئی انکار نہیں
منجمد لمحوں کو میں گرمیٔ بازار
سمجھ لوں کیسے ؟
جن کی شب ہے نہ سحر،
حُسن کے پاس نہیں حسنِ نظر

تم جو آذر ہو
جو بُت بیچتے ہو
تم نہیں جانتے یہ جسم نہیں
جبر کی تصویریں ہیں
تم نمائش گہہِ ہستی کے وہ سوداگر ہو
بُت بناتے ہو سجاتے ہو دکھاتے ہو، مگر
ایک لمحے میں کئی لمحے چھپا رکھے ہیں،

جان لے لینا تو آسان بہت ہے لیکن
ڈال دو جان کسی بُت میں
بہت مشکل ہے
آذری پیشۂ صد رنگ سہی
آج انسان اگر جبر کا خوگر ہے تو کل
ٹوٹ جائیں گے یہ بُت
جن کو سجاتے ہو صنم خانوں میں

جمیل ملک

زیاں آئینوں کا

ہم تو آئینہ دکھاتے ہی رہے
مافیا، جاگیرداری، زرگری اور جبر و استعمار نے
وہ کلاشنکف کلچر ہر طرف پھیلا دیا
جس نے دہشت ناک اور چیچک زدہ چہرے کو بھی
جمہوریت کے نام پر
اس قدر شفاف اور روشن کہا
جیسے اس نے آج تک وہ آئینہ دیکھا نہ ہو
جو لئے پھرتے ہیں، ہم
اپنی ہر تخلیق کے
ایک ایک اُجلے اور سنہرے لفظ میں
سوچتے ہیں اپنے لفظوں کا زیاں
یوں سرِ بازار پہلے تو کبھی ایسا نہ تھا، اتنا نہ تھا
جس قدر اس دَور میں
ہر آئینہ
بے نام و بے مفہوم ہو کر رہ گیا
اور مجرم
ہم سا ہر فنکار، ہر معصوم ہو کر رہ گیا

آفاق صدیقی

ہائیکو

اس جنگل سے بھاگ
پھنکاریں ہیں ڈسنے کو
کیسے کیسے ناگ

گلدانوں کے پھول
دیکھو تو ان پھولوں پر
آج ہے کتنی دھول

ساون کی برسات
نیل گگن سے لائی ہے
البیلی سوغات

پنگھٹ ہے سنسان
لوٹ لیا کس مورکھ نے
پنھاری کا مان

بچے کی مسکان
جیسے ہو پھول گلاب کا
آپ اپنی پہچان

یہ کوئل کی کوک
جانے اس پردے میں ہے
کس برہن کی ہوک

ناصر شہزاد

گیت

سانسیں ہیں مدہوش
تیری اُمنگ ترنگ میں کھو کر تیاگ دے دل نے ہوش
سانسیں ہیں مدہوش

مکئی ، گندم ، جَو ...
دھیان سبھی خود رَو
کون نگر میں جا کر پریتم ، مجھ سے ہوئے رُوپوش
سانسیں ہیں مدہوش

جھمکے ، جھومر ، ہار
سب بے بس بیکار
روک لیا اُس نے رستے پر ، میں زربُل نر دوش
سانسیں ہیں مدہوش

چندا ، جھرنے ، پھول
منہر مدھ ... کے طول
تیری دید سعید کی پیاسی یہ اکھیاں مے نوش
سانسیں ہیں مدہوش

سونے کی زنجیر
سُر کی سُدھ تاثیر
بول رَلن کے بکھریں تیرے میرے گوش بہ گوش
سانسیں ہیں مدہوش

مدہوش بلگرامی
(بھارت)

آرزو

میرا جی چاہتا ہے بیتے لمحوں کو بُلا بھیجوں
ذرا کچھ دیر کو اَب بچھڑی یادوں کو بُلا بھیجوں
حسیں پھولوں کو باغوں میں نکھرتا دیکھ لوں پھر سے
میں اپنی اُجڑی دنیا کو سنورتا دیکھ لوں پھر سے
نگر کی روشنی اور جھونپڑوں کا سُونا پن دیکھوں
کبھی فصلِ خزاں دیکھوں کبھی رنگِ چمن دیکھوں
سمندر کا نظارا کرلوں ساحل پہ کھڑے ہوکر
دوبارہ دیکھ لوں میں ڈوبتے سورج کو جی بھر کے

میرا جی چاہتا ہے .....

اندھیرے گہرے ہیں ہلکی کہیں تو روشنی دیکھوں
مہکتی اور چہکتی پھر خوشی کی زندگی دیکھوں
فلک کی سمت دیکھوں، چاند تاروں کی چمک دیکھوں
مرے کھوئے ہوئے سارے دیاروں کی دمک دیکھوں

میرا جی چاہتا ہے ....

مرے گھر کی زمیں اک بار پھر زرخیز ہو جائے
مری ہستی کا لمحہ لمحہ رنگ آمیز ہو جائے
فضا خاموش ہے، پھر ایک ہنگامہ بپا تو ہو
غزل ہو، ساز ہو، محفل کوئی آراستہ تو ہو
سنائی پھر سے دیں مانوس، دل آویز آوازیں
مری آنکھوں میں نیند آجائے کھُل جائیں مری باہیں

میرا جی چاہتا ہے ....

کسی جھرنے سے پانی پی کے اٹھوں تازہ دم ہولوں
گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں میں پل دو پل کو سو جاؤں
گلی کوچوں میں گھوموں، شاہراہوں پر نکل جاؤں
بسوں میں، رکشوں میں کر کے سفر چوراہے پر اُتروں

میرا جی چاہتا ہے ....

کسی مے خانے میں جاؤں شرابِ تلخ پی جاؤں
ذرا پھر جھوم اٹھوں دل کے تاروں پر غزل گاؤں
میری خوبی، مری کتیا، مری جانِ تمنا کو
اٹھالوں گود میں اور دُور تک پیدل چلا جاؤں

میرا جی چاہتا ہے ....

جلالوں شمعیں جو رکھی ہیں میرے تاب دانوں میں
لکھوں خط ان کو اُن کو صبح جاؤں ڈاک خانے تک
جواب آئے نہ آئے جذبوں کا اظہار تو کر دوں
کسی نکڑ پہ کھیلوں زندگی کا اِک نیا ناٹک
غمی کا ہو خوشی کا ہو، ادا خود ہی کروں کردار
جو چلتی پھرتی لاشیں ہیں انہیں کر دوں ذرا بیدار

میرا جی چاہتا ہے ....

خلل پڑ جائے سناٹوں میں پھر دستک سنائی دے
میں بڑھ کے کھول دوں چپکے سے اپنے گھر کا دروازہ
کوئی پھر جانا پہچانا مجھے سایہ دکھائی دے
وہ پوچھے حال مرا پی کے آنسو اتنا بتلا دوں
مری تیمارداری اب مری بیماری کرتی ہے۔
مری تنہائی اِک مدت سے مرے ساتھ رہتی ہے
مجھے معلوم ہے یہ ہو نہیں سکتا مگر پھر بھی
تصوّر کرتا ہوں، مجبور ہوں فطرت سے میں اپنی
اگر وہ تم ہو جس نے میرے خوابوں کو سجایا تھا
تو آؤ پھر سے میری زندگی میں رنگ بھر جاؤ
مری سانسوں میں خوشبو بن کے پھر سے تم بکھر جاؤ

میرا جی چاہتا ہے ....

یہی ہے جستجو باقی، یہی ہے آرزو باقی
کبھی حل ہو نہیں سکتے یہ پیچیدہ مسائل ہیں
مرے دائیں مرے بائیں مرے آگے مرے پیچھے
نہ جانے کب سے فولادی فصیلیں غم کی حائل ہیں
میرا جی چاہتا ہے بیتے لمحوں کو بلا بھیجوں
ذرا کچھ دیر کو اب بچھڑی یادوں کو بلا بھیجوں

کیول سُوری
(بھارت)

دُعا

اے خُدا ، ہے دُعا
تیری دھرتی پہ گل مُہر کھلتے رہیں
تیرے کھیتوں میں ہنستی رہیں بالیاں
تیرے جھرنوں میں نغمات پلتے رہیں
تیرے پھولوں میں ہو دائمی زندگی
اور سدا رقص بھنوروں کا جاری رہے
تتلیاں شوخ رنگوں کی اُڑتی رہیں
تیرے سبزے سے شبنم کی یاری رہے

آسماں پر ترے
چہچہاتے پرندوں کی ڈاریں یونہی
تیری مخلوق کو
اپنی چہکار سے
اونچی پرواز سے
گیت گانے کی ترغیب دیتی رہیں
اے خدا ، ہے دُعا
تیرے بچوں کے ہونٹوں پہ مسکان ہو
گولیاں گر چلیں

تیرے اعجاز سے
زرد پتّوں کی مانند بے جان ہوں

تیرے دریاؤں میں خونِ آدم نہ ہو
نام لیوا ترے خواب پھر بُن سکیں
اور حوّا کی آہوں میں ہو یہ اثر
بے سماعت ترے کان بھی سُن سکیں
اے خُدا ، ہے دُعا
تیرے ساگر ترے ساحلوں تک
چمکتی ہوئی جھاگ لاتے رہیں
اور اس جھاگ میں
جلتے پٹرول کی
بجھتی آشاؤں کی
راکھ شامل نہ ہو
اے خدا ، ہے دُعا
تو سلامت رہے !
تیرے مظلوم ، لاچار بندے تجھے
زندہ رہنے کی توفیق دیتے رہیں

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

ماہیئے

گھنگھور گھٹا چھائی
برسے گی مقدر سے، کانوں میں صدا آئی

دو نین نشیلے ہیں
انداز نگاروں کے، تیکھے ہیں کٹیلے ہیں

ہے چشمۂ زر جاری
دیکھی ہے گداؤں نے دربار کی دُرباری

دو نین ہمارے ہیں
تم لاکھ بُرا جانوں ہم دل سے تمہارے ہیں

شبرات کی شب تابی
تابانیاں دیتی ہے کچھ دیر کی بے خوابی

مغموم بھی ہنستے ہیں
اُس شہر کے ذروں سے انوار برستے ہیں

جوبن پہ بہاریں ہیں
ساجن تیرے آنگن میں جلووں کی قطاریں ہیں

شاہین بدر

سفید پرچم جلا ہوا ہے

یہ زندگی، ریگزارِ محشر
نہ سائباں ہے فلک کا سر پر
نہ زیرِ پا کوئی فرشِ خاکی
چہار سُو سیلِ آہ و گریہ
یہاں تمنائیں
بسترِ مرگ پر پڑی کھانستی ہیں ہر دم
ستارہ آنکھیں
بدن کے مرقد میں دھنس چکی ہیں
نہ چاندنی کی طلب ہے کوئی
نہ خوشبوؤں کی کوئی تمنا
یہاں خود اپنا عذاب اوڑھے
تمام مقتول اور قاتل
سب ایک صف میں کھڑے ہوئے ہیں
دُعا کی لَو بھی بجھی ہوئی ہے
سفید پرچم جلا ہوا ہے

نسیم سحر
(سعودیہ)

رنگ

کسی بھی فن کار کے قلم سے
جو نقش بنتے ہیں
اُن کے سب رنگ اس کی تخلیق میں دکھائی
ضرور دیتے ہیں

لیکن اِک رنگ
ایسا نہیں جو دکھائی دیتا نہیں کسی کو
مگر جو اپنی لطیف موجودگی کے گہرے طلسم سے بھی
رہائی دیتا نہیں کسی کو

اُسی سے شہکار بولتے ہیں
چھپے ہوئے راز کھولتے ہیں
وہ رنگ ہر فن کی آبرو ہے
وہ رنگ فنکار کا لہو ہے!

(اسلم کمال کی نذر)

کرشن ادیب
(بھارت)

بھرے گھر کی تنہائی

کبھی بادہ خانوں میں بیٹھے ہوئے
کبھی سُونی سڑکوں پہ آوارہ پھرتے ہوئے
سوچتا تھا سدا
مجھے کاش گھر ایک ایسا ملے
جہاں میرے بچوں کے ہوں قہقہے
جہاں چھوٹی رنگیں مسرّت کے ہوں چہچہے
بہت سال گزرے کہ اِک ایسا گھر مجھ کو مِل بھی گیا!
ایک مُدت گزرنے پہ بھی
خلاؤں کی سُولی پہ لٹکا ہوا
سرِ شام پھرتا ہوں اب ڈھونڈتا
وہی بادہ خانے
وہ ویران سڑکیں
کہ جن پہ آوارہ پھرتے ہوئے سوچتا تھا کبھی
کاش گھر ایک ایسا ملے
جہاں میرے بچوں کے ہوں قہقہے
جہاں چھوٹی، رنگیں مسرت کے ہوں چہچہے!!

زہیر کنجاہی

تنہائی

آمری تنہائی آ
آمرے گلے لگ جا
آج میرے سینے میں
ایک اُبلتا لاوا ہے
آج میرے جسم و جاں
زیست کا چھلاوا ہیں
مَیں نے اَبر دیکھے تھے
اُن کے خالی دامن میں
برچھیاں تھیں گولے تھے
بے لحاظ اولے تھے

آمری تنہائی آ
میری آنکھ خالی ہے
میرے صاف چہرے سے ظاہر لاُبالی ہے
سپاٹ میرا ماتھا ہے
لیکن میرے دونوں لَب شام کے جھرمٹ میں
بے خودی سے مِلتے ہیں
ساتھ ساتھ چلتے ہیں

آمری تنہائی آ
تُو ہے میری ہم سفر مَیں ہوں تیرا راستہ
تُو مری اُداسی کا
اِک لطیف واسطہ
بادلوں کی خُنکی سے
مَن کی پیاس بُجھتی ہے
آنسوؤں کی شبنم سے
آگ سَرد ہوتی ہے ؟
کون اَبر مانگے گا
کِس کو بحر ملتے ہیں ؟

آمری تنہائی آ
بَن کے میری ہمنوا .
میرے سینے سے لگ جا

احمد صغیر صدیقی

نظمیں

سارا سارا دن
ناخوش رہتا ہوں
خود کو خوش رکھنے کی خاطر

○

باہر جو کچھ ہے
اوروں کو دکھلانے کے لئے ہے
اندر کا منظر
مَیں نے رکھ چھوڑا ہے
اور طرح کا

○

وہ سب کچھ
مرے پاس تھا جو
مرے واسطے بوجھ سے کم نہ تھا
دے دیا مَیں نے اپنوں پرایوں کو
اور اب مرے پاس
کچھ بھی نہیں
آج کل میں یہی "کچھ نہیں"
ہر طرف بانٹتا پھر رہا ہوں

خالدہ سعید

آواز

کوئی آواز آتی ہے
مرے ویران لمحوں کو
مرے بے چین سپنوں کو
محبت سے سجاتی ہے
مری بے خواب پلکوں پر
مری بے تاب دھڑکن میں
دلِ ناداں کے آنگن میں
مری سوچوں کی شاخوں پر
مری مغموم یادوں پر
کبھی شبنم گراتی ہے
کبھی غنچے کھلاتی ہے
کوئی آواز آتی ہے
جنہیں میں بھولنا چاہوں
وہی باتیں سناتی ہے
دُکھوں کی راگنی گا کر
مرے سب غم جگاتی ہے

رخشندہ نوید

اقرار

سورج کی روپہلی کرنیں کمرے میں در آئی ہیں
سکھ کی نیند کا تکیہ سر کے نیچے رکھے سو جاؤں
خوشبو کے بادل نے مہک سے گوندھی ہیں
زلفیں میری
چڑیا کھڑکی سے باہر اعلانِ سحر لے آئی ہے
دھیرے دھیرے گھومتے پنکھے کی آواز کا سایہ ہے
دھڑکن دل میں پایل باندھ کے اُتری ہے
تن من کی سیراب زمیں پر خواب پھواریں برسی ہیں
سُکھ کی نیند کا تکیہ سر کے نیچے رکھے کھو جاؤں
رنگ ابھی تک پریوں کی نگری میں اڑائے پھرتے ہیں
آنکھ کی شوخی، اور مسرور تبسّم بوجھ نہیں رکھتے
سیم بدن میزان پہ رکھو اس لمحے
وہ پھول برابر نکلے گا

خالد نصر راجہ

زیرِ اثر

میں نے چاہا کہ اس سے گریزاں رہوں
پر — یہ ممکن نہ تھا
یہ بھی خواہش نہیں چاک داماں رہوں
یہ بھی اچھا نہیں کہ پریشاں رہوں
خواہشِ خوب تر
تھی مری ہمسفر
جس کے زیرِ اثر
کُو بکُو، در بدر
اُس کے کوچے میں مَیں نے پکارا اسے
ہر گزرتے ہوئے شخص سے
پوچھتا پوچھتا دُور تک
میں گیا
ہر کسی نے کہا
کس لئے؟ کس لئے؟
اس سے شوقِ ملاقات کا کچھ سبب؟
میں نے سر کو جھکا کر جواباً کہا
میں نہیں!
میرے دل کو یہ اصرار ہے
لوگ ہنسنے لگے اور کہنے لگے
عقل سے کام لے، عقل سے کام لے

آخری اسٹیشن

★ —————— امراؤ طارق

کسی کو معلوم نہ تھا یہ کون سا اسٹیشن ہے۔ اس اسٹیشن کا نام کیا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ مقفل تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا پٹ گرا ہوا تھا اور اندھی آنکھ کی طرح بے نور تھا۔ بے چھت پلیٹ فارم ویران پڑا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے دونوں سروں پر اسٹیشن کے نام کے سنگی بورڈ کالک سے اس طرح پُتے ہوئے تھے کہ ان پر لکھے ہوئے حروف کا کوئی نشان باقی نہ رہ گیا تھا۔ ریلوے کے عملے کا کوئی آدمی دُور دُور نظر نہ آتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر بنا ہوا سگنل کیبن ویران تھا۔ لائن بدلنے والے کانٹے کے دستے بندوقوں کی طرح آسمان کی طرف تنے ہوئے تھے۔ آدمی کوئی نہ تھا۔ تیسرے درجے کا تین طرف سے کُھلا ہوا ویٹنگ روم ویران پڑا ہوا تھا۔ کوئی کتا کوئی جانور اور کوئی رینگتا ہوا کیڑا تک نظر نہ آتا تھا۔ اسٹیشن سے باہر سڑک ویران تھی۔ سڑک پر اَن کُٹے روڑے بھاری رولر کے نیچے کُوٹے جانے کے انتظار میں بکھرے پڑے کچے تک پھیل گئے تھے۔ سڑک کے اُس پار ریلوے کے محکمے کے سرکاری مکان خالی پڑے تھے۔ دروازوں پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ بعض مکانوں کے دروازوں پر ٹاٹ کے پھٹے پردے ہوا سے اس طرح ہل رہے تھے کہ ان کے مقفل دروازوں کے کالے پیلے تالے صاف نظر آجاتے تھے۔ درختوں پر کوئی پرندہ نہ تھا۔ فضا میں کوئی ابابیل نہ تھی۔

ٹرین میں بیٹھے مسافر جیسے سکتے میں ہوں۔

سورج غروب ہونے میں اب تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔

ٹرین اب تک شمال کی طرف چلتی رہی تھی اور شمال کی طرف سطحِ سمندر سے ایسی بلندی تھی کہ جب ٹرین روانہ ہوئی تھی اس وقت آگے پیچھے دو انجن اسے چلا رہے تھے۔ جنوب سے شمال کی چڑھائی چڑھتے ہوئے ٹرین پہلے آؤٹر سگنل سے گزری، پھر جنوبی کیبن سے اور پھر پلیٹ فارم سے الگ آؤٹر لائن پر رک گئی تھی، یوں جیسے پلیٹ فارم والی لائن پر شمال کی جانب سے کوئی اور ٹرین آنے والی ہو۔

جب ٹرین اپنی منزل کی سمت روانہ ہوئی تھی اس وقت یہ مکمل ٹرین تھی۔ اس میں چار بوگیاں پھر کچھ گیرو رنگ کے مال گاڑی کے کُھلے کئی ڈبے اور پھر آخر میں مسافروں کے لئے ایک بوگی لگائی گئی تھی اور ٹرین کے آگے پیچھے دونوں طرف انجن لگے ہوئے تھے۔ گاڑی پتھر کے کوئلوں کے انجن سے چلائی گئی تھی۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی جس کے آس پاس کے تمام گاؤں اور شہروں سے لوگ دھڑا دھڑ بھاگ رہے تھے اور میونسپلٹی والے جو گھر خالی ہو جاتا اس کے دروازے کے پاس دیوار پر ایک چھوٹی آڑی لکیر سے دوسری چھوٹی آڑی لکیر کو کاٹ کر گھر خالی ہو جانے کا نشان لگا دیتے۔ گاؤں کے آدھے سے زیادہ مکانوں کے دروازوں کے قریب دیوار پر یہ نشان لگا ہوا تھا جب ٹرین پہنچی۔

پہلے تو سب یہی کہتے رہے کہ حالات پر قابو پالیں گے۔ گاؤں گھر چھوڑنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئے گی نقلِ مکانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن جب آس پاس زندگی غیر محفوظ ہوگئی اور لاشوں پر لاشے اٹھنے لگے تو لوگ بھاگنے لگے۔

شبراتی جولاہا، رمضان تمبولی، حافظ آتشباز اور مولانا سدن تو عصر کی نماز کے بعد بڑی مسجد کی فصیل پر سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور خوف ان کے چہروں پر نیم کے سائے کی طرح ڈولنے لگتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے کو ڈھارس دیتے مگر اندر ہی اندر اور خوفزدہ ہو جاتے۔

کمشنر گاؤں والوں کو اطمینان دلانے آیا تو گاؤں میں بازار کا دن تھا۔ اکا دکا دکانیں دوسرے گاؤں سے بھی آگئی تھیں۔ سب گاؤں کے بازار میں جمع ہو کر کمشنر کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے نجات دہندہ آگیا ہو۔ اس کے ساتھ تھانیدار، پولیس پلٹن اور لاؤ لشکر سب ہی کچھ تھا۔

بڑی احتیاط سے مختصر تقریر کی اور یقین دلایا کہ حالات قابو میں رہیں گے، بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھانیدار بھی سر ہلا ہلا کر کمشنر کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور سہما سہما چاروں طرف اس طرح دیکھتا رہا جیسے کسی گلی سے ابھی کوئی نکلے گا اور اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دے گا۔

کمشنر تقریر کر کے گیا تو اسی رات کئی آدمی مر گئے۔

بسنتا تیلی چھوٹی مسجد کے سامنے کی کچی دیوار پر چڑھ کر چلایا۔

"شبراتی رے شبراتی۔"

"اُوے مُلا آتشباز"

"رمجانی تمخلے"

"حافج جی" (حافظ جی)

وشواش گھات ہوئی گوا (دھوکا ہوگیا۔ بدعہدی ہوگئی)

ٹرین آکر رُکی تو شبراتی، رمضانی، حافظ آتشباز، مولانا سدن گاؤں والوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر موجود تھے گاؤں والے اپنے سامنے آجانے والے ڈبے میں سوار ہونے لگے۔ اُس پوری بوگی میں تھوڑے سے خستہ حال مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ جب یہ بوگی بھرنے لگی تو بعض مسافر اگلے انجن کے ساتھ جڑے ڈبے میں گھسنے لگے۔

"پیچھے جاؤ۔ اس بوگی میں جگہ نہیں ہے، پانی بھی نہیں ہے۔"

پریشان حال مسافر اس بوگی سے جڑی دوسری بوگی میں چڑھنے لگے۔

"پیچھے جاؤ۔ اس بوگی میں مت گھستو۔ یہاں پانی نہیں ہے۔"

مجبوراً مسافر تیسری بوگی کی طرف لپکے۔

"پیچھے جاؤ پیچھے۔ دونوں بوگیاں خالی ہیں اور مال گاڑی کے ڈبے لگے ہیں، ان پر سوار ہو جاؤ۔"

"مال گاڑی پر سوار ہونا جرم ہے، ناجائز ہے۔"

"اب کچھ ناجائز نہیں ہے۔ یہ دیکھو گے تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

گاؤں چھوڑ کر آنے والے مسافر زیادہ تر چوتھی اور سب سے آخری بوگی میں سوار ہو گئے اور جو بچ رہے وہ مال گاڑی کے ڈبوں میں جن پر چھت نہ تھی سوار ہو گئے۔

گاڑی کو دونوں انجن منزل کی طرف لے چلے۔ چڑھائی سخت رفتار سست تھی لیکن مسافر پرعزم مطمئن اور خوش تھے۔ پانچوں بوگیاں اور مال گاڑی کے ڈبے انسانوں سے کھچا کھچ بھر چکے تھے۔

جب کئی راتیں مسافروں کو جاگتے گزر گئیں تو وہ دوسروں کی تکلیف کا خیال کئے بغیر پاؤں پسارنے لگے، اور یہ احساس جاتا رہا کہ نیند میں پاؤں دوسرے مسافر کے منہ کو لگ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ جن میں طاقت تھی وہ اپنوں کے سونے کی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے برتنوں میں بوگی کا سارا پانی ذخیرہ کرنے لگے۔

سب سے پچھلے ڈبے میں تنازع بڑھ گیا۔ اگلے ڈبوں اور بوگیوں میں جگہ اور پانی کی کمی کے باعث ان بوگیوں سے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر لوگ اتر اتر کر چوتھی اور پانچویں بوگی میں کھلے دروازوں سے آنے کے بجائے کھڑکیوں سے کود کود کر بیٹھے ہوئے مسافروں کے اوپر پاؤں رکھ کر آنے لگے۔ ڈبے کے اندر جوں جوں جگہ تنگ ہونے لگی تنازع بڑھتا گیا

پانچویں بوگی کے مسافروں نے اندر سے سارے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر لیں اور دروازوں سے سامان لگا کر اس پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ہر اسٹیشن پر اگلی بوگیوں سے مسافر اتر کر پانچویں بوگی میں داخل ہونے کی کوشش کرتے دروازے پیٹتے کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کرتے اور اس پر چھوٹے بڑے جھگڑے ہوتے، مگر ٹرین چلتی رہی۔

ایک صبح جب اجالا پھیلا تو پانچویں بوگی اور پچھلا انجن ٹرین میں لگے ہوئے نہ تھے اور ٹرین صرف چار بوگیوں اور مال گاڑی کے ڈبوں تک باقی رہ گئی تھی۔ پانچویں بوگی اور پچھلے انجن کا کہیں دُور دُور پتہ نہ تھا۔

ساری ٹرین میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔

"وہ لوگ خود اپنی بوگی اور انجن لے کر چپکے سے بھاگ گئے۔"

"شاید اُس بوگی اور انجن پر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا ہو اور بوگی اور انجن ڈاکوؤں نے اپنے قبضے میں کر لئے ہوں۔"

"شاید اگلے انجن کے ڈرائیور نے رات کو کسی وقت ان کی بوگی کاٹ کر باقی ٹرین لے آیا ہو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔"

"کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ارے تم کو کیا پتہ اگلی بوگیوں والے اگلے انجن ڈرائیور سے ملے ہوئے ہوں گے۔"

"ہم کو بتائے بغیر ایسی سازش کیوں کر ممکن ہے؟"

"سب کچھ ممکن ہے۔"

مال گاڑی کے ڈبے سے جس کی چھت کھلی ہوئی تھی ایک آدمی چلایا۔

"وشواش گھات ہوا ہے۔"

سب کو بسنتا تیلی یاد آگیا جس نے چھوٹی مسجد کے سامنے کی دیوار پر چڑھ کر سندیس دیا تھا۔

اس ویران بے آب و گیاہ اسٹیشن پر بے بسی کی رات دبے پاؤں آ ہی گئی۔ ڈبے مردوں اور عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، جو شیر خوار تھے وہ ماؤں کے سینوں کو جونک کی طرح چمٹے چوس رہے تھے۔ خوف سے ماؤں کے سینے میں دودھ خشک ہو گیا تھا۔ بچے سہم کر اوندھے منہ ڈبوں کے فرش پر گر گئے تھے۔ مرد گھوڑوں کی طرح کنوتیاں تانے خطرے کی آواز سننے کی کوشش کر رہے تھے اور ذرا ذرا سی آہٹ پر خرگوش کی طرح اچھل پڑتے تھے۔ اُن کے پاس ان کی اور ان کے بچوں کی حفاظت کے لئے نہ ہتھیار تھا نہ تدبیر تھی اور نہ تدبر تھا۔

مال گاڑی کے ڈبوں میں پھر سے لوگ سورج غروب ہوتے ہی چلنے والی ٹھنڈی ہوا سے سردی محسوس کرنے لگے تھے بچوں کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ وہ ماؤں کے دوپٹے اوڑھے انگریزی ہندسے دو کی طرح سمٹے جاڑے سے کانپ رہے تھے مچھروں کی یلغار تھی اور ان کا وقت پر سرحدوں پر بہنے والا خون مچھر پی رہے تھے اور ان کے ایک طرف حدِ نظر تک پھیلے ریگستانوں کی ریت تھی جو اڑ اڑ کر ان کے منہ سے اور آنکھ میں لبالب بھر گئی تھی اور دوسری طرف گھنا جنگل تھا جس سے کوئی درندہ نکل کر ان سب کو اپنا نوالہ بنا سکتا تھا۔ انہیں اپنا چھوڑا ہوا گاؤں، اس کا تحفظ، اس کے کنوؤں کا میٹھا اور ٹھنڈا پانی یاد آ رہا تھا وہ رو رہے تھے اور پچھتاوے ان کے سامنے کھڑے تھے۔

رات بھر خوف بھوک پیاس اور بے چینی سے جاگتے رہنے کے باوجود رات کے پچھلے پہر مال گاڑی کے ڈبوں میں پھر سے مسافروں کی آنکھ لگ گئی اور جب صبح سویرے اُن سب کی آنکھ کھلی تو مسافروں سے بھری چاروں بند دروازوں اور بند کھڑکیوں والی بوگیاں اور انجن ان کے بے چھت مال گاڑی کے ڈبوں کو مسافروں سمیت بے یار و مددگار چھوڑ کر جا چکے تھے اور اب اس بے آب و گیاہ ویران اسٹیشن پر پلیٹ فارم کی دوسری جانب پٹڑی پر ان بے چھت مال گاڑی کے ڈبوں کے علاوہ کوئی بوگی، کوئی انجن اور کوئی ڈبہ نہ رہ گیا تھا۔ جانے رات کے اندھیرے میں کب آگے لگا ہوا انجن کھڑکیوں دروازوں، چھتوں اور پانی والی بوگیوں کو ان میں بھرے مسافروں سمیت لے کر چلا گیا تھا۔ ان بے چھت مال گاڑی کے ڈبوں میں بھرے مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے اور چاروں طرف دُور دُور تک کوئی چوپایا حتیٰ کہ کوئی پرندہ نظر نہ آتا تھا۔

فضا میں کوئی ابابیل بھی نہ تھی۔

❖ ❖ ❖

مجاہد

★

پروین سرور

گلی میں ہر شخص سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ برابر والے حویلی نما پرانے مکان میں کون آیا ہے؟

کوئی سمگلر ہے جو رات کے اندھیرے میں شراب اور ہیروئن کے ساتھ ناجائز کپڑا اور بجلی کا گھریلو سامان لیکر آتا ہے اور باڑے آباد کرتا ہے۔ یا پھر کوئی ایسا ایجنٹ ہے جس نے مکان میں اسلحہ کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔ کوئی جاسوس ہے جو وائرلیس پر یہاں کی خبریں وہاں پہنچاتا ہے۔ کوئی ڈاکوؤں کا گروہ ہے جو بڑے گھروں میں نقدی زیور اور گاڑی لوٹتے ہوئے تاوان کی غرض سے بچے بھی اغوا کرتا ہے۔

آج زمانہ ہی ایسا آگیا ہے کیا کہا جاسکتا ہے۔

اس بھرے بازار میں وہ خالی گھر ایک معمہ بنا ہوا تھا جس کا چوکیدار مہینوں دروازے پر بڑا سا تالا لگا کر غائب رہتا تھا اور اب راتوں رات کسی نے وہاں قبضہ جما لیا تھا۔ چاہے حالات کچھ بھی ہوں محلے والوں کی یہ اخلاقی ذمہ داری تھی کہ اس پر کڑی نظر رکھیں اور حفاظت بھی کریں۔ مگر یہ تو معلوم ہو کہ ایسا کون سا شخص ہے جو راتوں رات وارد ہو گیا ہے۔ نہ کسی سے ملتا ہے نہ کسی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ نہ کوئی اتہ نہ پتہ۔ کہاں سے آیا، کہاں گیا۔ کسی نے اس کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ ایک بار یہی سننے میں آیا تھا کہ کوئی کرایہ دار ہے، جو صبح ہی صبح تالا لگا کر کہیں چلا جاتا ہے اور رات کے اندھیرے میں واپس آجاتا ہے۔

مکان کا مالک تو ایک عرصہ ہوا ملک سے باہر رہتا ہے۔ پھر یہ کرایہ کی بات کس نے کی، ہو سکتا ہے کہ یہ بھی امریکہ یا لندن سے آیا ہو یا کوئی رشتہ دار ہو۔ لیکن رشتہ دار کیسے ہو سکتا ہے جبکہ تمام قریبی عزیزوں سے ناچاقی ہو۔ ہرگز ایسا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

دنیا بڑی وسیع ہے۔ ایک لندن اور امریکہ پر ہی کیا موقوف آجکل تو دبئی اور شارجہ کی بھی بڑی دھوم ہے ہر نوجوان کی آنکھ وہیں لگی ہے جسے دیکھو باہر جانے کی فکر میں ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے۔ جب سے ڈرائیور گل محمد نے دبئی سے اپنی بہو کے لئے مہر کے سونے کا لاکٹ بھیجا تھا بس تب ہی سے گھر گھر میں آگ لگی تھی۔ اگر کوئی پر لگا کر اڑ سکتا تو آج سارے ملک میں بے روزگاری کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہ رہتا، اور لڑکیاں بالیاں سونے کے کنگن

پہنے اتراتی پھرتیں۔

شاید اس گھر میں بھی وہیں سے کوئی مالدار شخص آیا ہو اس پرانے مکان کو نئے رجحان کے مطابق گرا کر نئے سرے سے بنگلہ بنوانا چاہتا ہو۔

صبح ہی صبح جب بابو حفیظ کمپنی باغ میں سیر کرنے کے بعد اُدھر آیا تو زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ بازار میں لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے۔ سکول کالج جانے والی لڑکیاں چادر اوڑھ کر سر جھکاتے چلی جا رہی تھیں۔ گائے بکریوں کے ریوڑ بے ربط انداز میں بھاگے جا رہے تھے۔ منہ مارتی بھیڑیں راستہ چلنے والوں کے لئے بڑی رکاوٹ ہو رہی تھیں۔ سب اپنے اپنے کام دھندے میں مصروف تھے۔ کمیٹی کے نل پر گھڑے اور بالٹیاں ایک قطار میں رکھی تھیں۔ پانی بوند بوند ٹپک رہا تھا۔ اس علاقے میں بھی شہر کے دوسرے بازاروں کی طرح ٹوٹی سڑکیں۔ اُبلتے گٹر اور غلاظت کے ڈھیر ایک مسئلہ بن چکے تھے مگر وہاں کے مکین اپنے گھر چھوڑ کر نفیس علاقوں میں جانے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ سب دکانداروں کی آپس کی چھوٹی چھوٹی تلخیوں کے باوجود دکھ درد سانجھے تھے۔ بیٹے بیٹیاں اپنے تھے اور ان رنجشوں میں بھی ایک لگاؤ تھا۔

عاشق پہلوان نے گوالے سے اپنی کڑھائی میں دودھ ڈلوایا، اور چولہا جلا کر اُبلنے کے لئے رکھ دیا۔ آج اس کو بہت کام تھا۔ موسم نے ذرا سی کروٹ بدلی تھی۔ سڑی گرمی کے بعد فضا میں سکون کی کیفیت تھی، اس لئے منچلے گاہکوں کے لئے ناشتہ کا اہتمام بہت ضروری تھا۔

رفیق پھلیرے نے اپنی دکان سجائی۔ تازہ گلاب اور گیندے کی بھینی خوشبو کھوکھوں کے نیچے بہتے گندے نالے کی بدبو میں مل رہی تھی۔ اس نے نل پر بھرا پانی کا ڈول اٹھایا اور نوخیز کلیوں کو چھینٹا دیا۔ پھر اونچی آواز میں بولا "سائیں حاتم کا عرس ہے۔ ذرا دیر میں ریل پیل ہو جائے گی۔ چادریں اور ہار پھول لینے والے آتے ہی ہوں گے۔ الائچی دانے اور بتاشے کا تبرک تیار کرنا ہوگا۔

ماڈرن ہیر کٹنگ والے محبوب عثمانی نے اپنی ذرا سی اونچی دکان میں پوری رفتار سے پنکھا چلا کر میزوں اور کرسیوں کو سنوار کر رکھا۔ کئی طرح کے شیمپو اور بال رنگنے کے لوشن نمایاں جگہ پر سجا دیئے۔ حمام پر نہانے والوں کے لئے صاف تولیے نکال کر باہر لٹکائے۔ ابھی دن ہلکا سا روشن ہو جائے گا تو پھر سر کھجانے کی فرصت بھی نہ ملے گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی ہماہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ اِکا دُکا گاہک بھی دکانوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ خاکروب سڑکوں کا کوڑا نالوں میں دھکیل کر فارغ ہوتے لگے مگر اُس گھر کی خاموشی بدستور آسیب زدہ محسوس ہو رہی تھی۔

بابو حفیظ کے گھر اور اُس گھر کے صحن کی دیوار مشترک تھی۔ اگر خوشگوار حالات ہوتے تو دونوں طرف کی گھر والیاں اینٹوں کا جو کا رکا آرپار کھڑی ہو کر گھنٹوں ہنسی ٹھٹھول کر سکتی تھیں۔ کئی تحفے ادھر کے ادھر پہنچاتے جا سکتے تھے۔ ہزاروں سوغاتیں تبدیل ہو سکتی تھیں۔ محلے والوں کے پوشیدہ راز اُگلے جا سکتے تھے۔ آخری چہار شنبہ اور عید میلاد کا بلاوا بھی دیا جا سکتا تھا گالیوں کوسنوں کا تبادلہ بھی ہو سکتا تھا۔ دیوار پھاند کر بچے بھی اِدھر اُدھر ہو سکتے تھے۔ مگر اس گھر میں بچے تو کیا ایک عورت بھی دکھائی نہیں دیتی تھی صرف چھت سے لے کر دالان تک گری ہوئی پرانی بیلوں میں گھونسلے لٹکتے رہتے تھے اور چڑیوں کی لڑائی

سے سکوت ٹوٹتا رہتا تھا۔

محبوب عثمانی نے ایک آرام دہ کرسی جھاڑ پونچھ کر رکھی اور بابو حفیظ کو بڑے احترام سے بٹھایا کیونکہ اس کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا اور وہ روزانہ سب کو اپنے گرد جمع کر کے ملکی اور غیر ملکی اہم خبریں سناتا تھا۔ کشمیر کی بگڑتی ہوئی صورتحال بھارتی فوج کے درندہ صفت مظالم اور مجاہدین کے کارناموں میں ہر ایک کو بیحد دلچسپی اور تشویش تھی، اس لئے لوگ دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے اور وہیں سارے فیصلے ہو جاتے۔

عاشق پہلوان نے جلدی جلدی لسی کا گلاس بابو حفیظ کو تھماتے ہوئے کہا۔ "بابو جی۔ سُنا ہے یہ کشمیر سے آیا ہے۔"

"کون؟"

اس نے جھک کر بابو حفیظ کے کان میں اس انداز سے سرگوشی کی کہ اس کی بات سب سُن سکیں۔

"مجاہد ہے۔ سیدھا کشمیر سے اُترا ہے۔"

سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

رفیق نے اپنی دکان سے نکلتے ہوئے اُڑتی خبر کے پَر کھینچ لئے۔ "کان کھول کر سُن لو۔ ہم نام کے ہی محمد رفیق نہیں ہیں۔ کام کے بھی دوست ہیں۔ اگر یہ ہمارا کشمیری بھائی ہے تو۔"

"ادے پھیکے۔ تو اکیلا ہی اس بازار میں نہیں ہے۔" عاشق پہلوان اپنے بازو کی مچھلیاں تھپتھپاتے ہوئے خم ٹھونک کر آگے آیا۔ وہ بھری سردی میں بھی دھوتی اور بنیان پہنے اینڈتا پھرتا تھا۔ اس لئے اس کا نمایاں گٹھا ہوا کسرتی بدن دلوں پر ہیبت طاری کرنے کو کافی تھا۔ اس نے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان ایک ہی داؤ میں چت کر کے رکھ دیئے تھے۔ اس کی للکار کا کیا مقابلہ۔

رفیق نے اس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر دم سادھ لیا۔ مٹھی میں پھولوں کی پنکھڑیاں سونگھنے کے بہانے اس نے نظریں جھکا لیں۔ عاشق ایک مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے سینہ تان کر بولا "ہم عاشق ہیں اللہ اور رسولؐ کے بعد اپنے کشمیر کے عاشق ہیں۔ اگر یہ کشمیری بھائی ہمارے کشمیر سے آیا ہے تو سر آنکھوں پر۔ صبح ہی صبح حلوہ پوری۔ نان نہاری کا ناشتہ سب بلا ناغہ وقت پر پہنچے گا۔ ہم دل والے ہیں۔ بڑے جگرے کے یار۔"

چندو کبابیہ کی ذرا عاشق سے کٹتی تھی۔ وہ تندور صاف کرتے ہوئے ذرا سا جھک کر بولا۔ "ارے کم تو ہم بھی کسی سے نہیں ہیں۔ مشہور زمانہ ہمدو کبابیہ کی اولاد ہیں۔ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔"

"کیا کر لوگے۔ کوئی نیا تیر مار لوگے؟" عاشق اسی آواز میں للکارا۔

چندو خم ٹھونک کر بولا۔ کہنے لگا۔ ہر قسم کا تکہ کباب۔ روسٹ بروسٹ ہماری طرف سے چلے گا۔ یہ کشمیری بھائی اپنا دیدار کرا دے۔ پھر دیکھنا۔"

"قسم اللہ پاک کی۔" عاشق بولا۔ "اپنے دونوں کاکے اس کے حوالے نہ کر دوں تو نام نہیں۔ وہ بھی اس دین کی لڑائی میں شہید ہو جائیں تو نصیب اپنا۔ دبئی کا نام نہیں لیں گے۔"

رفیق اپنی جگہ مسکرایا۔ اس نے گلاب گیندے کے ڈھیر پہ ایک مرتبہ پھر پانی کا چھینٹا دے دیا۔ "اجی۔ ہم نے لاکھوں دولہا سجائے ہیں۔ ہزاروں دلہنوں کو سہاگ کا زیور پہنایا ہے۔ پیروں فقیروں کے عرس مہکائے ہیں۔ چادریں پڑھائی ہیں۔"

"دیکھ پھیکے۔" عاشق نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارا۔ "یہ سب کام تو نے بے غرض تو نہیں کیا ہے۔ ان سب کاموں کا نقد وصول کیا ہے۔"

"ارے وہ نقد اپنی جگہ ــ یہ ہمارا روزگار ہے، مگر اب خدا قسم۔ اگر یہ اصل مجاہد ہے تو تازہ پھولوں میں ڈھک دوں گا۔ ڈھولچی کو لے آؤں گا۔ ایسا جلوس بنے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ نعت خواں ٹولیاں برابر میں چلیں گی۔"

"اشکے بھئی اشکے۔" چندو نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ "یار پھیکے تیرے جلوس کے لئے تو میں الائچی بادام بھری گلابی چائے کی سبیل لگا دوں گا۔ شربت، پانی اور ہر قسم کے کولا کی لوٹ چل جائے گی۔ پان سگریٹ مفت۔ کلہ بھر بھر چباؤ عیش کرو پیارے۔" پھر وہ کباب کی سیخیں اکٹھی کر کے بولا۔ "ایمان سے ایسی لالی ہونٹوں پہ اترے گی کہ فلم والیاں اپنے ہونٹ بھول جائیں گی۔"

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ ہاتھوں پہ ہاتھ مارے گئے جیسے سب نے کشمیر فتح کر لیا ہو۔

"کیا بات ہے ــ؟ کیوں چہک رہے ہو یار ــ سبھی لقہ کبوتر بنے پھڑپھڑا رہے ہو؟" چمپی والا نادر اپنی سوریے کی پھیری لگاتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا ــ پوچھنے لگا ــ "یہ ترنگ کیسی ــ کون آیا ہے ــ؟"

محبوب عثمانی نے اپنے سیلون میں سے جھانک کر نادر کی طرف دیکھا پھر حقارت سے منہ پھیر لیا۔ دراصل دونوں کی مخاصمت چلتی تھی۔ عثمانی کہتا تو یہاں نہ آیا کر۔ اور نادر کا کہنا تھا کہ زمین خدا کی ہے۔ جہاں میرا جی چاہے گا جاؤں گا۔ میں نے تو اپنے باپ دادا کا کام سنبھالا ہے تم اپنی دکان سنبھالو۔

"چاچا جی۔" نادر نے عاشق پہلوان کو مخاطب کر کے کہا۔ "سچ بتاؤ ــ کوئی نئی پالٹی بن رہی ہے۔ کوئی اپنے اس بازار کے سارے دکانداروں کی جماعت بن رہی ہے ــ؟ یا کوئی نیا لیڈر بڑھکیں مار رہا ہے۔"

"ارے لیڈر ــ کوئی ایسا ویسا۔" چندو نے عاشق کو کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ جھٹ جھٹ بڑے جذبے میں ڈوب کر بولا۔ "یہ اپنے بالشت بھر کے لیڈر اللہ مارے تو حقہ بھریں گے اس کا۔ تلوے چاٹیں گے۔"

نادر رازداری میں اس کی طرف جھک آیا۔ "پھر بھی ــ کون آیا ہے ــ؟"

"ارے یاروں کا یار ہے ــ اپنے کشمیر سے مجاہد آیا ہے۔"

"اوہ ــ" نادر نے گردن ہلائی اور وہیں زمین پر پالتی مار کر اپنی جگہ مضبوط کرتے ہوئے اعلان کیا۔ "جتنے دن بھی وہ یہاں رہے گا تو یار میرے ــ آنکھ کھلتے ہی اس کی چوکھٹ پکڑ لوں گا۔ چمپی مالش مفت ــ ایسا سر سہلاؤں گا ایسا تھپتھپاؤں گا کہ دگنی جان پڑ جائے گی۔"

اس نے دانتوں تلے اپنا نچلا ہونٹ دبایا۔ بے اختیار کھڑے ہو کر دائیں بائیں اپنے بازو پھیلا کر تلوار کی کاٹ

میں لہراتے ہوئے پھر اونچی آواز میں کہا: "ایسی بجلی بھر جائے گی میرے شیر میں کہ ڈھیر پڑے ہوں گے بے ایمانوں کے۔ کشمیر تو پاکستان میں آوے ہی آوے"۔ اس نے بھنگڑے کے انداز میں اپنے کندھے جھٹکائے اور کان پر ہاتھ رکھ کر، زوردار تان لگائی "آوے ہی آوے۔ آوے ہی آوے"۔

بزاز ہٹی والے نذیر بھائی ذرا دیر سے پہنچے تھے۔ سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ موسم کی حرارت دلوں کو گرما رہی تھی۔ ساری باتوں کی بھنک ان کے کان میں پڑ چکی تھی۔ پھر بھی نادر کو جو بے حال دیکھا تو اس کو روک کر بولے: "پاگل تو نہیں ہو گیا کیا؟"

"دیوانہ کہو نذیر بھائی — اپنے کشمیر اور کشمیری بھائیوں کا۔"

نذیر بھائی جلدی جلدی دکان کا تالا کھول کر اندر داخل ہوئے۔ کاؤنٹر کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا پھر الماری میں سے نئے بنڈل نکال کر قرینے سے سجاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پوچھنے لگے — "یہ کیا چکر ہے؛ ہم بھی تو سنیں پھیکے۔ کیا ہوا۔"

رفیق جلدی جلدی ان کے پاس آیا۔ "سنا تم نے نذیر بھائی۔ مجاہد اترا ہے حویلی میں۔ سیدھا کشمیر سے آیا ہے۔"

"کس نے کہا؟"

"سب کو معلوم ہے؛"

"یہ بات ہے؟"

"قسم اللہ پاک کی۔"

"تو ابھی لو — نذیر بھائی سب سے آگے نکلے گا انشاءاللہ۔ چار سوٹ بڑھیا بوسکی کے نذر چڑھیں گے۔ دو گھوڑے کی — ابھی کل ہی باڑے سے نیا مال پہنچا ہے۔"

"اجی گرہ دو گرہ اپنی عادت کے مطابق نہ جھاڑ لینا۔ کہیں کپڑا تنگ نہ پڑ جائے" — نذیر بھائی نے خون آلود نظروں سے دیکھا۔

"تم کپڑا الگ کرو۔ ماسٹر فیروز دین نے اپنے تھڑے پر سلائی مشین رکھ کر تیل ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ خاکسار راتوں رات اپنی آنکھوں کے بخیئے سی کر دے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ ناپ بالکل درست ہو۔" اس نے گلے میں پڑا ہوا فیتہ ہلایا۔

"ابھی لو" — نذیر بھائی نے دکان میں جا کر تھان الٹ پلٹ کر کہا — "رنگ پسند کر لو۔"

"رنگ تو اگر وہ مجاہد بھائی خود پسند کرتا تو اچھی بات تھی۔"

"وہ نہیں ہے تو تم تو ہو۔"

"دراصل یہ مجاہد لوگ تو زیادہ تر ملیشیا ہی پہنتے ہیں۔"

"وہ بھی موجود ہے" نذیر بھائی کھسیا کر بولے۔ دراصل اتنی جلدی کسی کو دیکھے بغیر کوئی فیصلہ انہوں نے

کبھی نہیں کیا تھا۔

"وہ بھی دیکھ لیں گے۔" ماسٹر فیروز دین نے گٹھڑی کھول کر سلائی طلب کپڑے الگ کئے اور عاشق کی طرف چلے گئے۔

کشمیری مجاہد کی خبر سارے بازار میں دھوم گئی۔ جن لوگوں کا راستہ اُدھر کا نہیں تھا وہ بھی بھاگے چلے آئے۔ ہر ایک اس فرشتے کے دیدار کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کو اور کوئی کام ہی نہیں۔ غیر ضروری گاہکی شروع ہو گئی۔ تالی کی پھٹکار میں تیار کی گئی پوریوں کا ڈھیر ہاتھوں ہاتھ جانے لگا۔ لوگوں نے لسی کے گلاس خالی کر دیئے۔ رفیق کی دکان پر عرس میں جانے والے عقیدت مندوں نے تازہ پھولوں اور چادروں کے ساتھ ساتھ الائچی دانے کا تبرک بھی سمیٹ لیا۔ محبوب عثمانی بھی مصروف ہو گئے۔ حمام پر نہانے والوں کی قطار لگ گئی۔ سبزی منڈی کی طرف جانے والے مزدور اپنے ٹوکرے سر پر اٹھائے آگے پیچھے رواں تھے۔ اناج ڈھونے والے گردن جھکائے ہانپ رہے تھے مگر جاتے جاتے سب رُک گئے اور بازار میں گزرنے کا راستہ بند ہو کر رہ گیا۔

"نذیر بھائی۔" وہ ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ "نذیر بھائی ہم نے سُنا ہے کہ تم کشمیری کو چار سوٹ دے گا۔"

نذیر بھائی نے چونک کر دیکھا۔ علی جُو اپنے کندھوں پر لدا ہوا بھاری سامان منڈی میں اُتار کر بھدے قدموں سے اس کے پاس آیا۔

"ٹھیک سُنا ہے تم نے علی جُو۔"

وہ ایک ہانجی تھا۔ اپنے آشیاں سے بچھڑا ہوا ایسا پرندہ جس کے پر کٹ چکے تھے مگر پھر بھی وہ کشمیر کی سرسبز وادیوں کی کھُلی فضا میں سانس لیتا تھا۔ سرمئی پہاڑوں کی اوٹ چنار کے پھیلے درختوں کے سائے میں گیت گاتا تھا۔ نیلی جھیل میں کھِلے کنول اور سنہری دھوپ میں چمکتے پتوں پر گری شبنم کے ہر قطرے کا عکس اس کے دل میں جھلملاتا تھا۔ خوابوں کا یہ طلسم اس کے گرد چھایا رہتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ نہ وہ کسی سے کھل کر بات کرتا۔ نہ ہنستا نہ مُسکراتا۔ اس چھوٹے سے بازار میں ایک کشمیری مزدور کی حیثیت سے صبح سے شام تک منوں بوجھ اٹھا اٹھا کر اس کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ نیلی آنکھیں اُبل کر باہر کو نکل آئی تھیں۔ اس کے بال جھڑ چکے تھے اور پیروں میں گٹھے پڑے تھے۔ وہ جوانی میں بوڑھا نظر آتا تھا۔

گہرا سانس لے کر اس نے کہا۔ "اپنا بوسکی کے ساتھ یہ بھی رکھ لو۔"

"یہ کیا ہے۔؟" نذیر بھائی نے حیرانی سے پوچھا۔

اس نے اپنی انگلی مروڑ کر پھنسی ہوئی چاندی کی انگوٹھی اتاری۔

"تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے کیا؟"

"ہاں۔ ہمارا منگنی کا انگوٹھی۔" ایک انتہائی پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک آئی اور پھر ختم ہو گئی۔ "اب اِس کو کشمیری بھائی پہنے گا۔"

"مت اتارو"۔ نذیر بھائی احساسِ ہمدردی میں ڈوب کر بولا۔ "پہنے رہو۔ یہ تمہاری زندگی کی بہترین یادگار ہے"۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے"۔

"کیوں"؟

"ماں باپ زندہ جلا دیا"۔ وہ اتھاہ مایوسی میں ڈوب کر بولا۔ "زیبو کو ہندو لے گیا۔ گھر کو مشین سے گرا دیا۔ ہمارا شکارا چھین لیا۔ اب اس کو رکھ کر کیا کرے گا"۔

نذیر بھائی نے گہری نظر سے دیکھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا جیسے اس نے اپنی تمام خواہشات کو ہمیشہ کے لئے بھاری پتھر سِل کے نیچے دفن کر دیا ہو۔

"ہم تمہاری شادی یہاں کریں گے"۔

علی جُو نے اپنے شانے پر نذیر بھائی کے نرم ہاتھ کی گرمی محسوس کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں — کیوں نہیں۔ رنگ برنگ جھنڈیاں سجیں گی۔ روشنی کی جگ مگ ہوگی۔ بڑی دھوم سے دلہن کے گھر بارات جائے گی۔ سب جمع ہوں گے۔ ولیمہ بھی ہماری طرف سے ہوگا۔ تم فکر مت کرو"۔

"نہیں کرے گا"۔ اس نے پورے زور سے نذیر بھائی کا ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیا۔ "ہرگز شادی نہیں کریگا۔ قیامت تک نہیں"؛ وہ پاگلوں کی طرح ہنسا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دیوانگی اُمڈ آئی — ایک دم پیچھے کی طرف مڑ کر رکشے میں سواریاں اترتے دیکھ کر وہ ادھر لپکا اور بھاری سامان اٹھا کر بڑی شاہراہ کی سمت بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

نذیر بھائی اس بدوضع انگوٹھی کو ہتھیلی پر رکھے گُم صُم کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس انگوٹھی کے نگینے میں سے علی جُو کے ارمانوں کا خون قطرہ قطرہ ٹپک کر ایک حسین داستان کو مرتب ہونے سے پہلے ہی آلودہ کر گیا ہے۔

ماسٹر فیروز دین اور نادر سر جھکائے کھڑے تھے۔ ایک سوگوار فضا دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ کشمیر کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور مسلمان کی زبوں حالی دلوں پر نقش تھی۔

"حفیظ بابو"۔ عاشق نے اچانک زوردار آواز میں خاموشی کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔ "کچھ ارد گرد کی خبر بھی ہے یا یونہی اخبار میں منہ چھپائے شام تک بیٹھے رہو گے"؟

"سن رہا ہوں — سب کچھ سُن رہا ہوں"۔ بابو حفیظ نے اخبار کے صفحے نیچے پھینک کر کہا۔ "بھلا مجاہد کا اس گلی میں کیا کام"؟

"بھرتی جو کرنے آیا ہے"۔ عاشق نے اپنے بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اب اتنے بھی بے خبر نہ سمجھو"۔

"بھائی میرے"۔ حفیظ بابو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مجاہد تو اپنے محاذ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا"

"نئی بھرتی کرنے کے لئے کہیں تو جاتے ہوں گے"۔ عاشق حفیظ بابو کی منطق ماننے کو تیار نہ تھا۔

"بالکل نہیں — وہ ذرا سا گلا صاف کرتے ہوئے کھنکار کر بولا۔ وہ تو ہر وقت اپنے کام میں مصروف

ان کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے "

چندو کبابیہ، نادر اور ماسٹر فیروز دین بالو حفیظ کے قریب آ گئے۔ رفیق نے اپنی ساری توجہ اس کی طرف کردی اور وہ اپنی معلومات کا ذخیرہ ان کے سامنے بکھیرنے لگا۔

" مجاہد تو اللہ کے سپاہی ہیں۔ ہر وقت اپنی صلیب اٹھائے پھرتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگاتے ہیں۔ اپنی آزادی۔ اپنے وطن، اپنی زمین، اپنے آسمان کے لئے بے خوف و خطر بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اس کھنڈر حویلی میں منہ چھپا کر تھوڑا ہی بیٹھیں گے۔"

"تو پھر ۔؟"

" پھر یہ کہ اب ہماری کڑی آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔ دشمن نے بتیس ہزار سے زیادہ دہشت گرد سرحد پار سے بھیج دیے ہیں۔ سب مل کر مقابلہ کرو۔"

" دہشت گرد ؟"

" دہشت گرد ۔؟"

" دہشت گرد ؟" — نذیر بھائی نے جلدی جلدی اپنے بکھرے ہوتے تھان سمیٹ لئے۔

" دہشت گرد ؟" — محبوب عثمانی نے حیرت سے کہا اور پھر اپنا سارا سامان الماری میں واپس رکھنا شروع کردیا۔

" دہشت گرد " ! چاروں طرف بچھو رینگنے لگے۔ ہجوم چھٹنے لگا۔ عاشق نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس حویلی میں مجاہد آئے یا دہشت گرد۔ دونوں کا کے دبی کے بدلے جہاد کے لئے جائیں گے اور انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

" رفیق نے زور سے ٹھنڈے پانی کا چھینٹا اس طرح پھولوں پر چھڑک دیا جیسے کشمیری مجاہدین کو نئی زندگی کا پیغام سنا رہا ہو۔

نادر خاموشی سے اُٹھا۔ اس نے حویلی کے دروازے کو پوری طاقت سے دھکا دیا۔ سوکھی دیمک جھڑ کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ دروازے کے دونوں پٹ اپنے کیل قبضے میں دائیں بائیں جھول گئے۔ آنگن میں پھیلی سوگوار اداسی میں کافور کی بو رچی تھی جیسے کشمیر کی اُجڑی وادیوں کی ویرانی وہاں اتر آئی ہو۔ کائی زدہ دیواروں کے سائے میں زرد پتوں کا ڈھیر تھا۔ کمروں میں بھوتوں کے مہیب سائے منڈلا رہے تھے۔ خوشیوں کو ترستی ہوئی فضا میں گہری خاموشی تھی۔

دروازے کے دھماکے کی آواز سے دانہ چگتی چڑیاں ایک ہی پھرے میں دیوار کے پار اُڑ گئیں۔ گلہریاں ٹھٹھک کر نیم کے گھنے درخت پر چڑھ گئیں جو آنگن کے ایک کونے میں بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمندر اور ساحل

★ شمشاد احمد

مردہ مچھلی کی بے نور آنکھ سے دہشت کا گدھ نکلا اور اڑتا ہوا سیدھا اس کے سر پر آبیٹھا۔

سمندر، گول گھومتی لہریں، ایک کے پیچھے ایک، اندھا دھند اٹھا اٹھا کر ساحل کی طرف پھینکے جا رہا تھا۔

اس نے لرزتے ہاتھ سے مچھلی کو دم سے پکڑا اور سانس روک کر واپس سمندر میں اچھال دیا۔ ابھی وہ ہاتھ دھو کر سونگھ رہا تھا کہ مچھلی ہچکولے کھاتی پھر اس کے قدموں میں آ رکی۔ وہ منہ پھیر کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے عقب میں دور تک سیاہ کھردری چٹانوں کی ایک طویل دیوار کھڑی تھی۔

سمندر کے بے جان شور کے علاوہ کہیں، کسی طرف کوئی زندہ آواز نہ تھی۔ اس کا مرمرا نڈھال دل جھٹکے کھا کھا کر چل رہا تھا۔

ایک ننھی سی رنگ برنگی چڑیا ہوتی — کالے سفید پروں والا بگلا ہوا میں لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے قیں قیں کرتا گزر جائے اتنی شدید تنہائی اور اتنا مردا سکوت! کیا میں مرنے والا ہوں؟

'میری ہونہار اولاد نے میرے سارے کام اپنے ذمے لے لئے ہیں۔ یہ تو پہلے ہی جھٹکے پر ہو گیا تھا۔ دوسرے حملے کے بعد عادت سے مجبور کبھی دفتر چلا گیا تو سب چھوڑ چھاڑ میری دیکھ بھال میں لگ جاتے ہیں جیسے میں ان کا حق چھیننے آ گیا ہوں۔ کبھی میں نے انہیں انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلایا تھا؛

"ابا جی — آپ کو ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔"

'ڈاکٹر، میری اولادیں اور خدا سب میرے خلاف مل گئے ہیں'

'مجھے روئی میں لپیٹ کر گھر چھوڑ جاتے ہیں، ٹھنڈے کمرے میں فوم کے آٹھ انچ گہرے گدے کی تنہائی میں زندہ دفنا کر پھر کام پر چلے جاتے ہیں۔ میں پوچھ بھی نہیں پاتا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ شاید اس لئے کہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے؛

دہشت اور تنہائی کا گدھ اپنی چونچ چلائے جا رہا ہے۔

'مصروفیت میں آدمی سر سے پاؤں تک سُن موجوں میں ڈوبتا اُبھرتا، لڑتا بھڑتا رہتا ہے۔ پھر اتنی عادت ہو جاتی

ہے کہ ساحل کی طرف دیکھنے سے دم گھٹنے لگتا ہے۔

میرے جسم پر گیلے کپڑوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ میں انہیں جھاڑنے کے لئے اٹھنے والا تھا کہ تیز ہوا کی سرسراہٹ میں بالکل اپنے قریب کسی اور کا احساس جاگا۔

خوف کی ایک لہر حیرت کو اُچھالتی ہوئی اٹھی اور مجھے روند گئی۔

وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دُکھ کی سیاہ چادر پر تازہ خوشی کے دھبے ابھرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ ایسی عجیب وغریب آنکھیں ٹٹولنے کا اس سے پہلے مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

وہ میرے لئے بالکل کورا اجنبی تھا۔

ستار کی تاروں کی طرح جھن جھن کرتے اعصاب کچھ ٹھہرنے لگے۔

میں نے جلدی سے اس کی منتظر آنکھوں میں ایک مصنوعی مسکراہٹ بھر دی۔

'اجنبی ہے تو بھی مُسکرا دینے میں کیا لگتا ہے'

اس کے پتھر چہرے کے پٹھے پگھلنے لگے اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی رو دوڑ گئی۔

'دور — بہت دُور کہیں ڈوبے ماضی کے پیٹ میں یہ چہرا میری نظر سے گزرا ہے — یا پھر کسی بھولے بسرے خواب کی یادگار ہے۔ کبھی کبھی کوئی چہرا بلاوجہ بھی آشنا سا لگنے لگتا ہے'

میں اس سے بات شروع کرنے میں جھجک رہا تھا۔ اس نے میری مشکل آسان کر دی۔

"اس دیوار کو گرانے میں وقت لگے گا — جانے گرتی بھی ہے یا نہیں۔ کوئی پچاس پچپن سال پیچھے کو الٹے قدم چلنا ہوگا — پاگل سمندر کی طرف نہیں، واپس خشکی کی طرف — ان سیاہ چٹانوں کے پار۔"

میں وہیں ساحل پہ کھڑا تھا اور الٹے قدموں چلنے لگا — چلتا چلا گیا۔

تلوؤں کو لپٹ لپٹ کر بوسے دینے والے قالین سے اتر کر کھُردرے فرش پر، پھر پتھریلی بل کھاتی پگڈنڈیوں پر، پھر خوشبوئیں لٹاتی مٹی پر — عمر کے دُکھتے سال ملحوں کی مانند اترتے چلے گئے۔ بے سُرا دل سُر میں آنے لگا اور آہیں بھرتے چیختے جوڑوں نے چُپ سادھ لی۔

میں کچی اینٹوں کے ایک جھونپڑے کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

ایک طرف بھُوری بھینس نیم دراز نیم وا آنکھیں مٹکاتی جگالی کر رہی تھی۔ اس کے قریب ہی کھلے آسمان کے نیچے سخت منجھ کی چارپائی پڑی تھی۔ اسکے رنگین پائے شام کی جاتی دھوپ میں رنگ بکھیر رہے تھے۔ اس چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے، حُقے کی نے کو سہلاتا ہوا ایک تنومند جوان بوڑھا بیٹھا تھا — اس کا ہر عضو پُرسکون تھا، کہیں کوئی جلدی نہ تھی۔

اس مکان کے اندر ایک عورت بھی رہتی تھی۔ اس کی آنکھیں شفق اور چاندنی تھی اور اس کی چھاتیوں سے دودھ کی نہریں اُبلتی تھیں — پھر ایک غول تھا — ہر سائز کے چھوٹے بڑے بچے — صبح سے شام تک زندگی کھیلتے رہتے تھے پھر ننھی چڑیوں کی ڈاریں درختوں کو جگائے رکھتی تھیں۔ چھت کی منڈیروں پر، چھجوں پر کوے اڑتے، پھدکتے رہتے تھے

اور کھیتوں کی ہریالی میں لچکتے کولہوں والی مٹیاروں کے سر پر چھلکتے گھڑوں اور گاگروں کا رقص۔

اجنبی مجھ سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ مکان کے بوسیدہ دروازے پر کھڑا میرا منتظر تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ میرا ہاتھ سنہری دھول سے اَٹ گیا۔

پھر میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ بے حد مضبوطی سے بند تھا۔

اجنبی نے آگے بڑھ کر مجھے روک دیا — میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

پہچان کی طویل وادی کے سارے سفر یک لخت طے پا گئے۔ وہ اجنبی مجھے اپنا لگنے لگا۔

'یہ تو وہی ہے جو میرے ساتھ اماں کی چھاتی سے دودھ نچوڑتا تھا۔ ساون کی دھواں دھار بارش میں مٹی کی چھتوں سے اترتا سُرخ پانی مجھ پر اچھالتا تھا — میں نے اسے سمندر کی لہروں کا کفن پہنا کر دفنا دیا۔ اس کے بعد مصروفیت دُم ہلا ہلا کر، لمبی زبان سے مجھے چاٹنے لگی اور میں اس کے نشے کا عادی ہو کر اُڑنے لگا — اُڑتا چلا گیا۔ زمین میرے قدموں سے نکل گئی — میں خوابوں کے درخت پر چڑھنے لگا — میں ہر صورت اس کی چوٹی کو چھُونا چاہتا تھا — میں جتنا اوپر جاتا، درخت کہیں زیادہ لمبا اور گھنا ہوتا چلا گیا — پھر ایک دن مجھے موت کے سانپ نے پہلی بار ڈسا اور میں دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ میری نظریں اب بھی اوپر ہی دیکھ رہی تھیں۔ نیچے دیکھنے کو بینائی ہی نہ بچی تھی۔

چڑھائی کی مشقت نے بدن کا سارا رس نچوڑ لیا ہے اور اب میں چُسی ہوئی گنڈیری کی طرح زندگی کے کوڑے دان میں پڑا ہوں۔ مجھے یہاں بھی وہ درخت دکھائی دے رہا ہے — میرے بیٹے مجھ سے زیادہ تندہی اور لگن سے اس پر چڑھ رہے ہیں اور درخت حسبِ معمول بلند ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی چوٹی بادلوں میں گم ہو گئی ہے۔

میں اور میرا ساتھی ابھی تک وہیں بند دروازے کے سامنے کھڑے ہیں۔ کواڑوں پر مٹی کی موٹی تہیں جمی ہیں۔ بارش اور دھوپ نے ان کا رنگ جگہ جگہ سے چاٹ لیا ہے۔

"انہیں توڑا بھی تو جا سکتا ہے۔" میری آنکھیں اس سے پوچھ رہی ہیں۔

وہ لپک کر میرے اور دروازے کے درمیان آ کھڑا ہوا۔

"یہ کواڑ تم نے خود بند کیے تھے۔ اب جو کچھ ان کے اندر ہے وہ تمہارے اور تمہاری آنے والی نسلوں پر حرام ہو گیا ہے — انہیں توڑ دو گے تو بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

میرے اندر بھوکی چیخیں رونے لگیں۔

"مجھے اندر جانا ہے — باہر بہت دھوپ ہے، اندر ٹھنڈی چھاؤں ہو گی۔"

اس کی آنکھیں پھر بولنے لگیں۔ وہ دروازے کے عین سامنے تن کر کھڑا تھا۔

"تم خوش نصیب ہو، پلٹ کر یہاں تک آ گئے ہو — تمہیں ابھی گم گشتہ جنت یاد ہے۔ آئندہ آنے والوں کی رسائی یہاں تک بھی نہ ہو گی۔"

میں اندر سے کٹنے لگا اور چُپ رہا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

اچانک ذہن میں ایک کوندا لپکا۔

"تم اتنا عرصہ کہاں رہے، تم تو میرے پاس آسکتے تھے"

ایک پھیکی، تلخ مسکراہٹ نے اس کے چہرے کی بچی کھچی رونق لوٹ لی۔ اس کا قد چھوٹا ہونے لگا اور وہ بولنے میں ہکلانے لگا۔

"میں ہر لمحہ تمہارے ساتھ تھا۔ تمہارے ساتھ دوڑتے دوڑتے میرے تلوے لہولہان ہو گئے ہیں، جسم ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور آنکھوں کی روشنی سوکھ گئی ہے ــــ میں تمہارے ساتھ لگا رہا ــــ اب بھی میں ہی تمہیں یہاں تک لے کر آیا ہوں"

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ مجھے گھور کر دیکھا اور ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔

"میرا شباب لوٹ آیا ہے ــــ لیکن تمہارا یہ موجوں کی مار کھایا جسم اب زیادہ دن نہ چل پائے گا۔ میں نے زندگی بھر تیرے ساتھ دُکھ جھیلے ہیں اور اب یہ سُکھ کی گھڑیاں بہت ہی تھوڑی ہیں۔ تم بہت ظالم نکلے ــــ اب اپنے ساتھ مجھے بھی مار ڈالو گے"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے رُخسار بھگونے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ روتا ہوا میرے اندر چلا گیا اور گم ہو گیا۔

میں اکیلا ساحل پر کھڑا ہوں۔ مردہ مچھلی ریت پر گال رکھے ویسے ہی پڑی ہے۔ میں اپنے ساتھی کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ وہ شاید ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا ہے۔

"کیا میں مرنے والا ہوں؟"

اچانک میرے دل کے اردگرد، چاروں طرف آگ کا الاؤ جل اٹھا ہے۔ شعلوں کی سرخ سلاخیں دل کو گودنے لگی ہیں۔

میں لڑکھڑایا اور گرنے لگا۔

میرے ڈرائیور کی نگاہ مجھ پر ہو گی۔ وہ بھاگا چلا آ رہا ہے۔

سمندر پر خاموشی طاری ہو گئی ہے ــــ لہریں جہاں تھیں، وہیں جم کر پتھر ہو گئی ہیں۔ میرے ساتھی کے ٹھنڈے آنسو میرے ماتھے سے ٹپکے جا رہے ہیں ــــ اب میں سچ مچ مر رہا ہوں۔

٭ ٭ ٭

جگن ناتھ آزاد
(جاپان)

○

حیرت ہے کہیں شیشہ، کہیں موم، کہیں سنگ
انساں کے بھی کیا روپ ہیں انساں کے بھی کیا رنگ

وسعت وہ بیاں میں تھی کہ گم اِس میں تھے آفاق
اور اس کے پسِ پردہ جو دیکھا تو دلِ تنگ

سینے میں ہمارے بھی نہاں سوزِ نوا تھا
دنیا نے مگر دی نہ ہمیں مہلتِ آہنگ

قصّے تری مہمان نوازی کے سُنے تھے
دیکھی ہے مگر صرف تری دعوتِ صد سنگ

ممکن ہو تو جو بند ہے دروازۂ دل کھول
شعروں کو سمجھنے کے لئے کھول نہ فرہنگ

قتیلؔ شفائی

○

چھوڑ کر تیری گلی چین کہاں لیتا ہوں
جسم میرا ہے یہاں سانس وہاں لیتا ہوں

چاہتا ہے وہ کہلوائے مری مِلکیت
شہر میں جو بھی کرائے کا مکاں لیتا ہوں

لوگ حیرت سے وہاں دیکھنے آتے ہیں مجھے
فخر کے ساتھ ترا نام جہاں لیتا ہوں

جب لپکتے ہیں تری یاد کے شعلے مجھ پر
اپنے بھیگے ہوئے تکیئے میں اماں لیتا ہوں

روشنی جو بھی دیا کرتے تھے شامِ ہجراں
اُن چراغوں سے میں اب صرف دھواں لیتا ہوں

اس کی وعدہ شکنی سے وہ ہوئی ہے عبرت
نہ زباں دیتا ہوں میں اب نہ زباں لیتا ہوں

کیا وفا اُس نے کسی ایک سے بھی کی ہے قتیلؔ
میں ذرا جا کے رقیبوں کا بیاں لیتا ہوں

احمد راہی

○

وہ ہم نوا نہ رہے اَب، وہ ہم زباں نہ رہے
عجب نہیں ہے اگر دورِ آسماں نہ رہے

ہر ایک بار یہی سوچ کر ملے اُن سے :
کہیں ادھوری محبت کی داستاں نہ رہے

کچھ ایسا قُرب ہو، ایسا ہو ربطِ قلب ونظر
حجاب کوئی بھی دونوں کے درمیاں نہ رہے

وفا شعاروں میں ایسے وفا شعار تھے ہم :
تمام عمر کبھی ان سے سرگراں نہ رہے

وہ بے حسی ہے کسی کو بھی یہ نہیں اِحساس
کہ کیسے کیسے اَب اہلِ جنوں یہاں نہ رہے

غمِ حبیب کا دعویٰ ہے جن کو شاد رہیں
غمِ جہاں کے تھے جتنے بھی رازداں نہ رہے

قدم قدم پہ سسکتی ہے ریزہ ریزہ حیات
کہاں رہے یہ دلِ مضطرب کہاں نہ رہے

شفیع عقیل

○

موسمِ ہجر ہے یہ جشن منائیں پھر سے !
کسی بے مہر کی یادوں کو سجائیں پھر سے

کیا کڑی دھوپ ہے سائے بھی بچھڑتے جائیں
راستے ڈر کے کہیں لوٹ نہ آئیں پھر سے

شہر تیرا ہے، یہاں کوچہ و بازار ترے
دل دھڑکتا ہے کہیں بھول نہ جائیں پھر سے

ایک تصویر سرِ شام طلوع ایسے ہوئی
یاد آنے لگیں اپنی ہی جفائیں پھر سے

کوئی آیا ہے درِ یار پہ دستک سی ہوئی
اپنے بچھڑے ہوئے غم ڈھونڈ کے لائیں پھر سے

چاند نکلا تو ذرا دیر کو دل سنبھلا تھا
رات نے اوڑھ لیں تاریک ردائیں پھر سے

ایسی تنہائی میں کس سوچ میں بیٹھے ہو عقیلؔ
دل کے صحرا میں، چلو پھول کھلائیں پھر سے

○

بچے ہوئے تھے جو پتّے یہاں خزاؤں سے
بکھر گئے وہی نرم رو ہواؤں سے !

تپی منڈیر پہ بیٹھا ہوا پرندہ ہے !
ڈرا ہوا ہے وہ شاید شجر کی چھاؤں سے

رُتوں نے دیکھ لیا ہے چلن زمینوں کا
برس رہی ہے تمازت یہاں گھٹاؤں سے

فضائے شب سے کوئی آفتاب گزرا ہے
سکوت گونج رہا ہے یہاں گھٹاؤں سے

عجیب روپ میں دیکھا اُسے زمانے نے
وہ سادہ لڑکی جو آئی کبھی تھی گاؤں سے

دیارِ غیر میں یادیں قدم قدم پر تھیں
جُدا ہوئی نہ سفر میں زمین پاؤں سے

وہ کیسا خواب تھا کل شب عقیلؔ آنکھوں میں
وجود گونج رہا ہے مرا نداؤں سے

جعفر شیرازی

○

اُسے کھوکر بہت کھویا ہُوا ہوں
اب اپنے آپ کو بھُولا ہُوا ہوں

یہ مَیں ہوں رُو برو جو اَب تمہارے
مثالِ آئینہ رکھا ہُوا ہوں

سُنو! اب تو قیامت آگئی ہے
مَیں کب کا آپ سے بچھڑا ہُوا ہوں

مَیں رو سکتا ہوں اس کے غم میں لیکن
سمندر کی طرح ٹھہرا ہُوا ہوں

کہا سورج نے اَب دیکھو نہ دیکھو
سوا نیزے پہ مَیں آیا ہُوا ہوں

مِرے ہاتھوں میں دیکھو کہکشاں ہے
کہاں میں تھا کہاں پہنچا ہُوا ہوں

مجھے تم ڈھونڈ لینا جب بھی چاہو
اُفق کے پار تک بِکھرا ہُوا ہوں

ڈھلی جب رات جعفؔر یاد آیا !!
مَیں گھر سے صُبح کا نکلا ہُوا ہوں

حسن اختر جلیل

○

سر و دستار کے ایثار کی ہمت نہیں پڑتی !
دلوں میں سچ ہے اور اظہار کی ہمت نہیں پڑتی

درختِ ظلم سے سب لوگ نالاں بھی ہیں ترساں بھی
تیر ہاتھوں میں ہیں اور وار کی ہمت نہیں پڑتی

حصارِ جبر سے سر پھوڑنا اچھا تو لگتا ہے
مگر عقلِ جنوں بیزار کی ہمت نہیں پڑتی

ہوس کاروں کی شہرِ حُسن پر یلغار ہے لیکن
سپاہِ عشق کو پیکار کی ہمت نہیں پڑتی

اُدھر وہ جن کو خو ہے اپنے وعدے سے مُکرنے کی
اِدھر ہم ہیں جنہیں تکرار کی ہمت نہیں پڑتی

یہی کہہ دے کہ جھوٹے ہیں یہ سب گفتار کے غازی
کسی بھی صاحبِ کردار کی ہمت نہیں پڑتی

جلیل اپنے بھی سینے میں بپا شورِ اَنا الحق ہے
مگر احیائے رسمِ دار کی ہمت نہیں پڑتی !

عبدالقوی ضیاء
(امریکا)

○

دل کو خوں بے سبب کیا ہم نے
حال اپنا عجب کیا ہم نے

جب تری زُلف کھُل کے لہرائی
اُسی لمحے کو شب کیا ہم نے

تم ہمارے اگر نہیں نہ سہی
اس کا دعویٰ بھی کب کیا ہم نے

زندگی ایک جنگ تھی جس میں
موت کو جاں بلب کیا ہم نے

ترے عارض کی چھاؤں میں اکثر
مہر و مہ کو طلب کیا ہم نے

پی لیا جامِ زہر ہنس کے ضیاءؔ
سچ کو نام و نسب کیا ہم نے

افضل منہاس

○

کون سی شکل میں حالات کی تصویر بنے
یہ نہ ہو پھُول بناؤں تو وہ زنجیر بنے

فن کی منزل کو قلم جبت لگا کر چھُو لے
تاکہ میری بھی جہاں میں کوئی جاگیر بنے

ایسی بھی ساعتِ خوش بخت مرے بخت میں لکھ
جس طرح چاہوں، وہی خواب کی تعبیر بنے

کس کڑے دشت کو زرخیز کیا تھا میں نے
اُس کو تحریر میں لانا ہے کہ تقدیر بنے

جو محبت مرے افکار سے چھلکی تا زیست
اُس کی ہر بُوند سے الفاظ کی تاثیر بنے

دامنِ زیست میں مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں
لیکن اِک بات کہ اس خاک سے اکسیر بنے

سب ہی اپنے ہیں، ہر اک سے مرا رشتہ دل کا
میرے حصّے میں جو آتے نہ وہ شمشیر بنے

یہ تو کر سکتے ہیں پیکان چلانے والے
تختۂ گل میں کہیں تُربتِ نخچیر بنے

جن کو چلنے کا سلیقہ نہیں آتا افضلؔ
حیرتی ہوں کہ وہی میرے عِناں گیر بنے

(مرحوم کی ایک آخری غزل)

جگر جالندھری
(بھارت)

○

میرے دشمن کو یہ پتا ہی نہیں
دشمنی سے بڑی سزا ہی نہیں

وقت ہر وقت چلتا رہتا ہے
یہ مسافر کبھی تھکا ہی نہیں

منزلوں پہ مری نگاہیں ہیں
راستوں کو مَیں دیکھتا ہی نہیں

آج کو ہاتھ سے نہ جانے دو
کل کسی کو کبھی مِلا ہی نہیں

ایک قیامت کا شور ہے باہر
کوئی اندر سے بولتا ہی نہیں

دشمنی سے یہ کب بدلتی ہے
دوستی کو تُو جانتا ہی نہیں

وہ بھی کہتے ہیں ہم مسیحا ہیں
جن کے ہاتھوں کوئی بچا ہی نہیں

کہنے والے کو دیکھتے ہیں سبھی
کیا کہا کوئی دیکھتا ہی نہیں

خود کو کھو کھر خدا کو پاؤ گے
اَے جگر! اور راستا ہی نہیں

کرشن کمار طُور
(بھارت)

○

سر کو اندازۂ اسرار اُنا دیتے ہیں
ہو گئے خاک یہ اِک بات بتا دینے میں

مَیں تو اَب خود سے بھی انکار ہوں کرنے والا
میرا کچھ جاتا نہیں اس کو بھلا دینے میں

خود تو ہوں عکسِ سرِ شیشۂ نازک لیکن
کتنا سفّاک ہوں اوروں کو سزا دینے میں

وہ مرے خون کا پیاسا سہی لیکن میں بھی
ہوں کم اندیش اسے شاخِ حنا دینے میں

جسم خانہ میں رہو گے بھلا کب تک اے طور
دیر کتنی ہے یہ دیوار گرا دینے میں

انوار فیروز

○

ضمیر میں نے سیاسی جوئے میں ہار دیا
جو رہنما تھا مرا اس کو میں نے مار دیا

سیاہ رات کے بدلے نئی سحر دے دی
خزاں کو ختم کیا مژدۂ بہار دیا

بچائی آبرو گلشن کی، جان دے کر بھی
جو قرض تھا مری جاں پر وہ سب اتار دیا

روش روش پہ جلائے ہیں خونِ دل سے چراغ
کلی کو حُسن دیا پھول کو نکھار دیا

جسے بچایا تھا دشمن کی فوج سے میں نے
اُسی نے ہی مجھے اپنا عدو قرار دیا

یہی تو میری محبت کا استعارہ ہے
وہ ظلم کرتا رہا میں نے اس کو پیار دیا

نئے زمانے کا قابیل دیکھ لے انوارؔ
کہ اس نے غصّے میں اپنا ہی بھائی مار دیا

انور شعورؔ

○

ذرا سی صبوحی پلا دیجئے
میں سویا ہُوا ہوں جگا دیجئے

پیالے میں بھر دیجئے بوند بوند
صراحی ٹھکانے لگا دیجئے

محبت سے اب دل بہلتا نہیں
کھلونا کوئی دوسرا دیجئے

اگر ہے یہی مول تول آج کل
تو کیا لیجئے اور کیا دیجئے

مجھے چھوڑ رکھا ہے کیوں ناتمام
بنا دیجئے یا مٹا دیجئے

بہت پی چکا ہوں شرابِ حیات
مجھے کوئی میٹھی دوا دیجئے

گیا وقت آتا نہیں واقعی
تو جو ہو چکا ہے بھلا دیجئے

شعورؔ آپ کا مدّعا سُن لیا
بس اب دوسروں کو جگہ دیجئے

صابر آفاقی

○

محشرِ آہ و بکا میں خامشی کام آئے گی
یہ جو میرے پاس ہے افسردگی کام آئے گی

اے اندھیرے کے بچاری کیا ترے بچے نہیں
روشنی رہنے دے، اُن کو روشنی کام آئے گی

جب ترازو پر تلے گا نیتِ خالص کا زر!
کون کہتا ہے کہ اس دن بندگی کام آئے گی

فلسفے نے اور بھی اس قوم کو پتھرا دیا
خون گرمانے کو میری شاعری کام آئے گی

نوشگفتہ پھول کی طرح شگفتہ لب رہو
بزمِ یاراں میں تمہاری تازگی کام آئے گی

تم خدارا مت بجھاؤ جگنوؤں کی روشنی
پھٹ گیا اوزون تو ان کی روشنی کام آئے گی

دین و دنیا کا نہ چھوڑا صابر آفاقی مجھے
میں سمجھتا تھا کہ میرے دل لگی کام آئے گی

عاصی کاشمیری
(انگلستان)

○

کچھ آپ سے اُمیدِ محبت نہیں رکھتے
ہم ریت پہ بنیادِ عمارت نہیں رکھتے

بدنام ہوں میں گرچہ بہت اہلِ وفا میں
اچھی تو کوئی آپ بھی شہرت نہیں رکھتے

بازار کے نیلام پہ موقوف نہیں ہے
بِک جاتے ہیں وہ لوگ جو قیمت نہیں رکھتے

ہمدردی کے دو بول تو کہہ سکتے ہیں لیکن
پر پیار کے اظہار کی جرأت نہیں رکھتے

میلوں کا سفر سامنے آنکھوں کے ہے عاصی
جب چار قدم چلنے کی ہمت نہیں رکھتے

صابر ظفر

○

کتنی مُدت بعد مِلا تھا اس سے مِرا نصیبا
مار دیا مِرے یار کو تُو نے حاسدِ درد رقیبا

تیری نمازیں اور دعائیں یار سے گر نہ ملائیں
چھوڑ مسیت اور توڑ مصلاّ بَن میں بیٹھ خطیبا

ہجر کا گھاؤ کیوں نہیں بھرتا (گھاؤ کیوں نہیں بھرتا)
تیرے بس سے باہر ہے کیا میرا حال طبیبا

جیون اُلجھا کن کانٹوں میں (اُلجھا کن کانٹوں میں)
جانتا تھا تو کیوں نہیں رکھی، میری لاج حبیبا

اتنا رُلنے پر بھی اب تک، سُدھرا نہیں ظفرؔ تُو
چال وہی بے ڈھنگی تیری کام ہے بے ترتیبا

سرور کاشمیری

○

میرے چمن کا حال یہ کیا کر دیا گیا
پھولوں میں جذب زہرِ صبا کر دیا گیا

کتنے ہی گلبدن اسے جاتے ہیں پوجنے
پتھر کے آدمی کو خدا کر دیا گیا

سنتے نہیں تھے لوگ صدائیں ضمیر کی
نازل یہاں عذابِ صدا کر دیا گیا

جکڑا ہے اُس کو دوستو زنجیرِ وقت نے
مِسمار سب غرورِ انا کر دیا گیا

پھولوں کی بستیوں میں بھی بستے تھے سنگدل
ملتے ہی اُس کو مجھ سے جدا کر دیا گیا

سرؔور مرے چمن میں کچھ ایسی ہوا چلی
خوشبو کو قیدِ گل سے رہا کر دیا گیا

اُمِ لیلیٰ

○

موسم کی پہلی بارش نے دل کو پھر ویران کیا
اشکوں کو سیلاب کیا اور یادوں کو طوفان کیا

پہلے کچھ آوازیں تھیں جو میرا تعاقب کرتی تھیں
اب تو میرے اندر کے سناٹے نے حیران کیا

کرچی کرچی ہو کے جب میں ٹوٹ گئی تو شیشے نے
مُجھ کو سُندر کہہ کے کیسا مجھ پر یہ احسان کیا

میری باتوں سے اُکتا کر چاند مجھے جب چھوڑ گیا
آخرِ شب کے تاروں نے پھر چاہت کا پیمان کیا

کِس کِس نے کیا غم بخشے ہیں اس کا سب احساس تو ہے
مَیں نے لیلیٰ جان بوجھ کر دل کو خود انجان کیا

نعیمہ ضیاالدین
(جرمنی)

○

اجنبی ہی رہا ہے بے وفا شہر یہ
خواہشوں نے بھی کیسا چُنا شہر یہ

منجمد برف زاروں میں ہیں محفلیں
چُپ کے پتھر تلے ہے دبا شہر یہ

خاک چھانی ہے اک عمر تک اور اب
ہم ہیں اپنے، نہ اپنا ہوا شہر یہ

سارے چہروں پہ تحریر ایسی تھکن !
جو شب و روز ہے لکھ رہا شہر یہ

کوئی گوری، نہ پنگھٹ، نہ سرگوشیاں
بس مشینوں کا انبار سا شہر یہ

بڑھ کے تنہائیاں بھی گلے سے ملیں
موسموں سے گلے جب مِلا شہر یہ

ایک ہمراز ڈھونڈے سے ملتا نہیں
گو سدا بھیڑ میں ہے گھرا شہر یہ

اے مرے دل، ترا اب ٹھکانہ کہاں
وہ ترا شہر اور نہ ترا شہر یہ

رب نواز مائلؔ

○

اُس سے سوچوں اس سے ہی دیکھا کروں
اور کتنا میں اُسے پہنا کروں

جیسے بن بولے بھی تو ہوتی ہو بات
میں کہیَ ناتے نہ یوں سمجھا کروں

جس سے رستے تک بھرے اس سے ملیں
اُس کو اپنا یوں بھی کچھ پایا کروں !

جس پہ دل آجائے جو اپنا دِکھے
اُس سے کہنے کو بھی کیا روٹھا کروں

ہو نہ آزادی تو جینا موت ہے !
اس برس سمجھوں تو یہ سمجھا کروں

وہ میرا کتنا ہے مائلؔ اس سے کیا
میرا مسلک ہے اسے چاہا کروں

زاہد امیرؔ

○

اگ آئے تھے جو بھولے سے اشجار ریت میں
آندھی چلی تو ہو گئے مسمار ریت میں

کچھ یوں رہے ہیں برسرِ پیکار ریت میں !
خود ہی اُٹھائی ریت کی دیوار ریت میں

صدیوں کی تشنگی کو سمندر کی تھی طلب !
گر کے یہ اشک بھی گئے بیکار ریت میں

اِک گرد باد حُسن تھا جب تک رہا رہا !
بیٹھا تو پھر سے مِل گئے اسرار ریت میں

خوں رنگ ہے زمیں ابھی تک لبِ فرات
کِھلتے ہیں اس طرح کے بھی گلزار ریت میں

اک اک یقیں کی اوٹ سے نکلے گماں امیرؔ
پھر آئینہ بدل گیا اک بار ریت میں

شہباز ندیم ضیاء
(بھارت)

○

کچھ اس سلیقے سے اونچا اپنا قد کرنا!
جو نادرست ہوں اشعار اُن کو رَد کرنا
حقیر لفظ کو بھی قابلِ سند کرنا
جو شعر کہنا تو شہباز فن کی حد کرنا

عمل ہے جادۂ دشوار سے گزرنے کا
کچھ اتنا سہل نہیں خود کو معتمد کرنا
مَیں شوقِ کارِ وفا میں نکل پڑا گھر سے
قدم قدم پہ الٰہی مِری مدد کرنا

تعلقات میں یہ دورُخی تعجب ہے
کہ مِلتے رہنا مسلسل، مگر حسد کرنا
ہے میرے حق میں یہی مرضیٔ خدا شاید
کہ اپنے دل کو تمناؤں کی لحد کرنا

سُلگنا پڑتا ہے خود تجربوں کے شعلوں میں
کچھ اتنا سہل نہیں فرقِ نیک و بد کرنا
ہے کون رونقِ کاشانۂ دل اے شہباز
کبھی تو شعر میں اظہارِ خال و خد کرنا

غنا کاشمیری

○

نیلند سے بوجھل اُن آنکھوں میں پیار بھری تحریر ملی
جب جب دیکھا ڈوب کے ان میں اپنی ہی تصویر ملی

کیا تبلائیں دربدری کا ہم سے کیسا جُرم ہوا
مٹی سے چاہت کرنے کی ہم کو ہے تعزیر ملی

اُلجھ گیا جب کانٹوں سے تو پھر یہ لیر و لیر ہوا
سر پر ٹھہرے آنچل کو ہی دنیا میں توقیر ملی

قاتل و مقتل سجے سجے تھے ہم بھی نکھرے نکھرے تھے
قتل کرے کس ڈھب سے ہم کو اِسکی نہیں تدبیر ملی

آنکھوں کے پیمانوں میں تو شبنم سنستی رہتی ہے
کس نے غنا یہ سوچا ہوگا، دل دنیا دلگیر ملی

جاوید راہی

○

تذکرہ بہاروں کا :
گرتی آبشاروں کا :

آسماں سے اترا ہے
سلسلہ ستاروں کا

کیا ہوئے سہاروں کو
رابطہ سہاروں کا

راکھ راکھ چنگاری
حوصلہ ہے یاروں کا

ڈھونڈنا سمندر میں
راستہ کناروں کا

دھول کا عجب منظر
قافلہ ہے کاروں کا

زندگی وہی راہی
فیصلہ جو ساروں کا

آغا ریاض احمد

○

سر ضرورت سے جھکا ہو جیسے
سامنے والا خدا ہو جیسے

سب حجاباتِ سماعت اٹھے
تیرے آنے کی صدا ہو جیسے

یہ تیرا حسن یہ رنگین شباب
سات رنگوں سے بنا ہو جیسے

ہر طرف اونچی فصیلوں کا ہجوم
زندگی ایک سزا ہو جیسے

کرچیاں یوں ہیں شکستِ دل کی
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

دہر میں اس طرح جیتے ہیں ریاض
زیست اوروں کی رضا ہو جیسے

محمد حسین کنول

○

ٹوٹے مکاں ہیں جوئے رواں تیرے شہر میں
طوفاں کے مل رہے ہیں نشاں تیرے شہر میں

بدلے ہوئے ہیں پیر و جواں تیرے شہر میں
حیواں کا آدمی پہ گماں تیرے شہر میں

تاریکیاں محیط فصیلوں پہ چار سُو
دن کا نہیں ہے نام و نشاں تیرے شہر میں

صحرا ہو یا کہ دشت کہیں بھی تو کچھ نہیں
عمرِ عزیز کا ہے زیاں تیرے شہر میں

تجھ سے اگر تھے دُور مسرت تھی کچھ قریب
ہر وقت اب ہیں نوحہ کناں تیرے شہر میں

ہلتا نہیں ہے ایک گھٹن سی ہے ہر طرف
تازہ ہوا کا نام و نشاں تیرے شہر میں

اظہارِ حق کا کیسے ارادہ کوئی کرے
کٹتی ہے سچ پہ آج زباں تیرے شہر میں

جھوٹی کہانیوں میں پھنسا ہے ہر ایک شخص
کرتا ہے کون سچ کا بیاں تیرے شہر میں

تُو خود ہی آ سکے تو چلا آ کنول کے پاس
تجھ کو ہی چل کے ڈھونڈے کہاں تیرے شہر میں

اخلاق عاطف

○

دلوں میں پیار نصیبوں میں نفرتیں لکھ دیں
عجیب تُو نے ہماری یہ قسمتیں لکھ دیں !

نہ جن کا انت نہ منزل نہ کوئی مقصد ہے
ہمارے پاؤں میں ایسی مسافتیں لکھ دیں

جو ایک موڑ پر بچھڑیں کبھی نہ مل پائیں !
ہر ایک موڑ پر اُن کی ضرورتیں لکھ دیں

دیا ہے فخر بھی دو چار دن مگر ایسا !
کہ اُس کے بعد سدا کی ندامتیں لکھ دیں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ لکھنے والے نے
ہمارے ہاتھ پہ کیسی عبارتیں لکھ دیں

دیا ہے ذوقِ صداقت جنہیں زمانے میں
انہی کے واسطے پیہم صعوبتیں لکھ دیں

سبھی ترے ہیں تو یہ امتیاز کیسا ہے ؟
کسی کو درد، کسی کو مسرّتیں لکھ دیں

محبت ایک سے کی ہے اور اس کے بعد عاطف
سبھی کے باب میں ہم نے عقیدتیں لکھ دیں

سرور ارمان

پھول اپنی جگہ، خار اپنی جگہ
باغبانوں کا کردار اپنی جگہ
تنگ گلیوں کے اسرار اپنی جگہ
شاہی مسجد کے مینار اپنی جگہ
ہم سے جھک کر خریدا نہیں جاسکا
حُسن تھا جنسِ بازار اپنی جگہ
گاؤں میں آنچلوں کی ضرورت بھی ہے
آپ کے سر پہ دستار اپنی جگہ
لب گریزاں تھے جس وقت اظہار سے
آنکھ تھی محوِ گفتار اپنی جگہ
اِک نئی زندگی کی علامات ہیں
بیج اپنی جگہ، دار اپنی جگہ
عرضِ چشمِ کرم کی اجازت تو ہو
آپ کا حرفِ انکار اپنی جگہ
بچ نکلنے کی تدبیر تو چاہیئے
ڈوب جانے کے آثار اپنی جگہ

ریاض تسنیم

مختصر۔ اپنی قسمتیں ہیں عجیب
اور یہاں کی محبّتیں ہیں عجیب
وہ بھی وعدہ کوئی نبھا نہ سکا
اور میری ضرورتیں ہیں عجیب
جُز ترے کچھ نہ دیکھنا چاہوں
کس قدر اپنی عادتیں ہیں عجیب
قاف میں کیا ہے پتھروں کے سِوا
سچ تو یہ ہے روایتیں ہیں عجیب
دُوریاں شدّتوں سے یاد آئیں
جو ملی ہیں وہ قُربتیں ہیں عجیب
شام، اندیشہ، لمحۂ رخصت !
اِک ذرا ٹھہر! ساعتیں ہیں عجیب
گونجتی ہیں خموشیاں ان میں
چار سُو یہ عمارتیں ہیں عجیب
زندگی اِک کتابِ گرد آلود
اور اس کی عبارتیں ہیں عجیب

معظم سعید
(بحرین)

تیری چاہت کا اثر ہے روح کی گہرائی تک
دل کی دھڑکن اور میری آنکھ کی بینائی تک

دیکھ کر تیرا حسیں چہرہ سبھی شرما گئے
چاندنی بھی چاند کی اور پھولوں کی رعنائی تک

یاد کرتا ہوں تجھے مَیں تیرے ہر اوصاف سے
ہاں مگر کچھ لوگ کہتے ہیں تجھے ہرجائی تک

دل پریشاں ہے تمہاری بے رُخی سے کچھ ضرور
ہار لیکن مَیں نہ مانوں گا تری پسپائی تک

اک عذابِ جاں ہے میرے واسطے اس کا خیال
چھین کر جو لے گیا مجھ سے مری تنہائی تک

نام تیرا مَیں بھی شامل شاعری میں کر تو لُوں
بات پہنچے گی مگر بڑھ کے تری رسوائی تک

کتنا مشکل ہوگیا ہے سانس لینا بھی سعید
چلتے چلتے رُک گئی ہے اب یہاں پُروائی تک

حسن اعزاز

یوں بھی ہے کہ دل کہنے کی ہمت نہیں رکھتا
ایسا بھی نہیں تجھ سے شکایت نہیں رکھتا

ہر آنکھ کبھی ایک سے آنسو نہیں رکھتی
ہر پھول، کبھی ایک سی رنگت نہیں رکھتا

آنکھوں میں، جو آنسو ہیں تو کیا اس کا بھلا غم
میں زخم کو سہنے کی تو ہمت نہیں رکھتا

ہر موڑ پہ ہر گام پہ کھاتا ہے جو ٹھوکر :
یہ دل کہ سنبھلنے کی جو ہمت نہیں رکھتا

یہ سوچ کے لوٹا ہوں مگر راہِ وفا سے :
شاید تجھے پانے کی مَیں قسمت نہیں رکھتا

اے چاند حسیں کہتی ہے کیونکر تجھے دُنیا
تُو تو مرے مہتاب سی صورت نہیں رکھتا

اُس جیسا نہیں قیمتی کچھ میری نظر میں
مَیں اُس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتا

یاسمین سحر

○

راستہ ہے کٹھن سفر تنہا
ہم بھٹکتے ہیں در بدر تنہا

چاند تارے کہاں پہ جا سوئے
آسماں کی ہے رہگزر تنہا

شبِ ہجراں! ذرا ٹھہر کے چل
عمر ہوتی نہیں بسر تنہا

کس قدر پیار ہے اندھیرے سے
شمع جلتی ہے رات بھر تنہا

دل میں آباد کوئی خواب نہیں
کس کے غم میں ہے چشم تر تنہا

سائیں سائیں مکان کرتا ہے
ہے بھرے شہر میں بھی گھر تنہا

زندگی کے اندھیرے رستے پر
ہم مسافر ہیں بے خبر تنہا

سایہ کیسے وہ دے گا ہر گھر کو
دھوپ شدت کی ہے شجر تنہا

عارف فرہاد

○

آنکھیں ہیں نڈھال اس ایک غم پر
کھلتا ہی نہیں جہاں ہم پر

غربت کا عجب ہے لطف لیکن
رسوائی بھی ہے قدم قدم پر

دل کو ہے خیال تیرا، ورنہ
کب تھا یہ مہربان ہم پر

کچھ اور نکھرنا چاہتا ہے!
کچھ اور بکھیر دھوپ الم پر

ممکن ہے کہ وہ اسی سفر میں
مل جائے مجھے کسی قدم پر

رشتہ نہ رہا کوئی تو فرہاد
الزام اب کیا دھریں صنم پر

واخان پامیر ٹریک کے
سفرنامے "یاک سرائے" سے

وادئ بروغل

★ ——— مستنصر حسین تارڑ

ایک گہری ناآسودگی اور آزردگی ہمارے ساتھ چلی آئی جب ہم جھیل کرومبر کے آخری کنارے سے بلند ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب ہمیں وادئ بروغل میں داخل ہونے کے لئے ایک بلند اور دشوار درّہ پار کرنا ہوگا۔ اور ہم وادئ بروغل کے لئے یا درّہ درکوت کے لئے کوئی کشش کوئی لگاؤ محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہم نے جو کچھ دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا جس سے ملاقات کرنی تھی، کرلی اور اب واپسی کے سفر کا آغاز ہوچکا تھا۔

انسان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے ہی طے کرلیتا ہے کہ اس کی زندگی اس مخصوص ڈگر پر ہی گزرے گی اور یوں اس کے ردّعمل طے شدہ ہوتے ہیں لیکن نادیدہ اَن دیکھے عناصر کا معجزہ ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ منصوبہ بندی اور مخصوص ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں۔

ہمارا خیال تھا کہ ہماری متلاشی نگاہوں اور بدن کو حیرتوں سے بھر دینے والی کوہ نوردی کا اختتام ہوچکا ہے اور اب ایک روٹین واپسی ہے... ہم خوابوں کے ممکنات سے آزاد بالکل خالی ہوکر گھر لوٹ رہے تھے۔

لیکن ہم کب جانتے تھے کہ نصیب کی انگلیاں کیا لکھ رہی ہیں۔ ان کی تحریر میں تو یہ درج ہو رہا تھا کہ سفر کا آغاز تو اب ہوا ہے، اس لئے کہ کرومبر کے آخری کناروں سے جب ہم اٹھتے ہیں اور ہم ایک پُر دشوار درّے کی کراسنگ سے خوفزدہ ہیں۔ صرف دس منٹ میں ہم ایک ٹیلہ عبور کرتے ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انجانی کائنات کی طرح وادئ بروغل کی عظیم وسعت پھیل جاتی ہے۔

کرومبر کے بعد ایک اور جھیل خشک پامیر کے اندر۔ اور ہم اس کے کناروں پر سر جھکائے چلتے ہوئے... پھر ایک اور جھیل... اور جب پانچویں جھیل کو ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے کہ ہم جھیل کرومبر سے بےوفائی نہیں کرنا چاہتے تھے، ہم ذرا بلندی پر پہنچے تو سامنے بروغل تھی۔ ہم اس کے وجود سے قطعی طور پر لاعلم تھے...

ہمیں پچھلی شب یہ شائبہ بھی نہ تھا کہ ایک ٹیلے کے پار ایک اور وادی ہے، صرف پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر وادئ سونج کے ہم پلہ ایک اور وادی ہے... اس کی تاحدِ نظر وسعت پر یقین نہیں آرہا تھا... میں نے آج تک اتنے بڑے پھیلاؤ کی وادی پر نگاہ نہیں کی تھی... سامنے بروغل تھی۔

اور دائیں جانب پامیر کے دامن میں جو جھیل تھی اس سے پرے پامیر کی بلند ڈھلوانوں پر ہم نے پہلی بار ایک بہت

ہی طویل فاصلے پر یاک کے ریوڑ چرتے ہوئے دیکھے۔ وہ سیاہ چیونٹیوں کی طرح برف کی قربت میں غول کے غول سیاہ دھبے تھے جو یقیناً حرکت کرتے ہوں گے لیکن طویل فاصلہ ان کی حرکت کو ہماری آنکھوں تک لانے میں ناکام ہو رہا تھا۔۔۔ اور بائیں جانب گلیشیئرز کی سفیدیوں کے سلسلے تھے جن کے عین نیچے ایک وسیع میدان نما چراگاہ تھی جس میں دریائے چترال کے آغاز سے پانی کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت منتشر ہو کر بہتے چلے جا رہے تھے اور یہاں بھی سینکڑوں یاک ہریاول کے گھنے سبزے میں رینگ رہے تھے۔۔۔ وہ نسبتاً قریب تھے اس لئے زندہ اور متحرک دکھائی دیتے تھے۔۔۔ ہریاول کے ان ندی نالوں میں منقسم میدانوں پر بادلوں کے سائے کہیں تھے اور کہیں وہ دھوپ میں تھے۔۔۔ اتنے سارے یاک دیکھ کر ہم بھی تھوڑے سے یاک ہو گئے۔

رُک سیک کندھوں سے اتار کر ہم ان کی تصویریں اتارنے میں محو ہو گئے۔ فاصلہ اتنا تھا کہ ننگی آنکھ سے تو وہ دِکھتے تھے لیکن جب یہی آنکھ انہیں کیمرے کے ویو فائنڈر میں تلاش کرتی تو وہ گم ہو جاتے تھے۔۔۔ وادیٔ بروغل کی یہ بلند چراگاہیں ان یاکوں کا گھر تھیں۔

وادیٔ بروغل چترال کی بلند ترین اور دُور افتادہ وادی ہے اور یہاں جتنے گھر ہیں، گاؤں ہیں اور پہاڑوں میں بکھرے ہوئے چولہے ہیں ان کے مکینوں کے یاک موسمِ گرما میں، یہاں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہاں گھاس اور پانی کی افراط ہے، اور یاکوں کی پسند کے برفیلے موسم بھی ہیں — یہ یاک سرائے ہے۔۔۔ انہیں دیکھ کر پہلے تو یہی خیال آتا ہے کہ یہ سب جنگلی ہیں، کیونکہ دُور دُور تک کسی گڈریئے، کسی دیکھ بھال کرنے والے کا نام و نشان نہ تھا۔

بقائ نیچے اتر کر گلیشیئرز کے دامن میں دریائے چترال کے منبعے کے قریب ہو کر ان یاکوں کے کلوز اَپ بنانا چاہتا تھا "میاں صاحب آجائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اِن یاکوں میں یاکنیاں بھی ہیں اور ایک یاکنی تو مجھے یہیں سے اتنی حسین دکھائی دے رہی ہے کہ اسے قریب جا کر نہ دیکھنا زیادتی ہو گی۔"

"ناں بھئی یہ بھی میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے۔" میاں صاحب نے صاف انکار کر دیا۔

"خالد۔۔۔ فوٹو نہیں کھچوانی یاک کے ساتھ۔۔۔" اب کے بقائ نے خالد کی منت کی۔

خالد ملتانی نے اترائی کو دیکھا، طویل فاصلے کو نظر سے ماپا اور پھر کہنے لگا۔ "نہیں یار یاک خطرناک ہوتے ہیں۔ میں نے خود پڑھا ہے کہ سپین میں یاک فائٹنگ ہوتی ہے جس میں کئی بار یاک انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔"

"خالد صاحب۔۔۔ سپین میں تو غالباً بل فائٹنگ ہوتی ہے۔۔۔ یاک تو نہیں ہوتے۔"

"تو یاک کیا ہوتا ہے تارڑ صاحب۔۔۔ بُل کا ذرا بلندی پر رہنے والا چاچا تایا ہوتا ہے ناں۔۔۔

"نہ۔۔۔ میں نہیں تصویر کھنچواتا۔۔۔ یوں بھی میرا نکوٹین لیول بہت گر چکا ہے۔" اس نے سگریٹ سلگا کر ایک طویل سُوٹا لگایا اور دھوئیں کو دیر تک پھیپھڑوں میں رہنے دیا۔

ڈرپوک ملتانی۔" بقائ نے ایک قہقہہ لگایا جو وادی کی وسعت میں گم ہو گیا اور کیمرہ سنبھالتا نیچے چراگاہ کی طرف اترنے لگا۔ اور یہاں دائیں اور بائیں صرف یاکوں کی بستیاں ہی نہیں تھیں بلکہ سامنے بروغل کی فضائے بسیط بھی تھی۔ اُس کے فراخ

گھاس میدان ایسی وسعت اور اتنی دُوری پر تھے کہ نظر ان کی حدوں تک پرواز کرنے سے قاصر تھی۔ ان کی حیران کُن کشادگی میں سرد ہوا بھی اپنی تندی کھو رہی تھی اور ہم اس بلندی پر سے کہیں کہیں ان ندیوں کی جھلک دیکھتے تھے جو گھنی گھاس کے ٹیلوں میں کبھی پوشیدہ ہو جاتی تھیں اور کبھی ان کی پارہ چمک بجلی کے کوندے کی طرح لپکتی اور گم ہو جاتی تھی جیسے ایک سبز آسمان زمین پر بچھا ہو اور اس میں بجلی چمکتی ہو۔

وادیٔ بروغل کی حیرت انگیزی بلندیوں کا ایک معجزہ تھی اور ہم اس کا نظارہ کرنے والوں میں سے تھے اور ہمیں اس معجزے کے اندر تک جانا تھا ـــــ میرے پاس کشادگی کی اس گھاس بھری بہتی ندیوں کی شفافی کی سرد کائنات کی وسعت کی ایک تصویر ہے۔۔۔ گھاس کے بے حساب میدانوں کے آخر میں جو برف پوش نیلے بھورے اور سلیٹی رنگ کے پہاڑ ہیں۔ وہ ایک واٹر کلر تصویر کی مانند نیلے آسمان سے بالکل جُدا اور ایک مصوّر کے بُرش کی تخلیق لگتے ہیں اور اس میدان میں سفید ہیٹ سُرخ ٹی شرٹ اور نیلی جین میں سر جھکائے ایک شخص چلا جا رہا ہے اور وادی کی وسعت میں ایک دھبّہ سا ہے۔ بہت آگے اُسی راستے پر چند نکتے ہیں جو پورٹر ہو سکتے ہیں۔۔۔۔

اس وادی کی منظر کشی کے لئے۔۔۔ اور کسی بھی کوہستانی بُلندی کو بیان کرنے کے لئے صرف لفظ ہی درکار نہیں۔ ہوا کا شور، پامیر کی بلند چراگاہوں سے اترتی سردی کی سرسراہٹ بھی درکار ہے۔ لفظوں کی مدد سے جو تصویر بنتی ہے اُس میں مکمل خاموشی ہوتی ہے جیسے ایک رقص کو پس منظر موسیقی کے بغیر دیکھا جائے۔۔۔ اسی طور گلیشیئرز میں سے اترنے والے ندی نالوں کا شور۔ گھاس پر چلتی ہوا کی ہزاروں سرگوشیوں کی صدائیں اور شائد آپ کے دل کے دھڑکنے کی آواز کے بغیر وادیٔ بروغل کی لفظی تصویر میں سناٹا رہے گا۔

بقاء ہانپتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔

"یاکنی کیسی تھی؟" میاں صاحب نے فوراً پوچھا۔

"میں زیادہ قریب جا کر تصویر نہیں اتار سکا۔"

"کیوں؟"

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ یاکنیاں کس طرح دیکھتی ہیں؟"

"کس طرح دیکھتی ہیں؟"

"قریب جاؤ تو اس طرح گھُورتی ہیں کہ اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔"

"اور جاؤ یاکنیوں کے پاس۔" میاں صاحب بے حد پُرمسرت ہوئے۔

خالد ندیم ایک بے مہار کیفیت میں سر ہلاتا اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اور ہر کسی کی طرف دیکھ کر بے وجہ مسکراتا تھا

"تارڑ صاحب، میری ایک گزارش ہے۔"

"جی ارشاد۔"

"آج یہیں رُک جائیں۔۔۔"

"پندرہ منٹ کے سفر کے بعد رُک جائیں... اگر رُکتے ہیں تو کیا کریں گے ؟"

"ریلیکس کرتے ہیں، پکنک مناتے ہیں... خیمے یوں نصب کرتے ہیں کہ ان میں لیٹ کر برد غل کی چراگاہیں دکھائی دیں.... نہیں نہیں بلکہ اُن کا رُخ ادھر کرتے ہیں یا میری جھیل کی طرف اور یاک بھی دکھائی دیں گے اور..." وہ رُک گیا اور مزید مُسکرانے لگا۔ "نہیں میرا خیال ہے خیموں کا چہرہ ادھر موجدھر گلیشیئر کے نیچے گھاس کے میدانوں میں ندیاں دکھائی دیتی ہیں اور یاک... تارڑ صاحب آپ سمجھتے ہیں ناں جگہ بہت عالی شان ہے۔"

"پورٹر آگے جا چکے ہیں۔"

"تو میں سیٹی بجا کر انہیں متوجہ کر لیتا ہوں۔ بہت زبردست سیٹی بجاتا ہوں۔ دوست احباب مجھے فلم دیکھنے کے لئے صرف اس لئے ساتھ لے کر جاتے ہیں کہ مناسب مواقع پر مُنہ میں انگلیاں گھسیڑ کر سینما ہال میں بیٹھی پبلک کے کان بہرے کر دوں... بجاؤں سیٹی ؟"

"اگر پورٹر واپس آجاتے ہیں اور ہم یہیں رُک جاتے ہیں تو ہمارے بجٹ میں اضافی ادائیگی کی وجہ سے تین سو روپے فی کس اضافہ ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں سائیں : خالد ملتانی پاؤں پسارے گھاس پر لیٹا تھا، اور لوٹیاں لگانے کے موڈ میں تھا۔ "تین سو روپے میں اس وادی میں ایک دن اور ایک رات.... مہنگا سودا نہیں۔"

"اور اگر ہم شیڈیول کے مطابق درکوٹ گاؤں میں نہیں اترتے تو ہمیں گلگت سے جانے والی جیپیں واپس چلی جائیں گی... ان کا خرچہ بھی پڑے گا اور ہمیں مزید دو روز پیدل بھی چلنا پڑے گا۔"

"ہاں یہ سودا مہنگا ہے۔" خالد نے فوراً اتفاق کیا۔ "پھر کبھی سہی..."

"پھر کب یار..." خالد ندیم کے چہرے پر ایک اونٹ کی اداسی تھی۔ "حبیب بینک ایمپرس روڈ برانچ میں ایک بندہ رجسٹروں اور واؤچروں کے پلندے پرے کر کے اُٹھتے ہوئے، کمر سیدھی کرتے ہوئے مینجر صاحب کو یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سر میں ذرا وادیٔ بروغل تک ہو آؤں۔ ان علاقوں میں یہی مصیبت ہے کہ یہاں پھر کبھی سہی نہیں ہوتا.... اب یا کبھی نہیں، ہوتا ہے۔"

خالد کی آہ و فغاں نے ہم پر بھی اثر کیا اور ہم اپنے اپنے ماحول کے مطابق سوچنے لگے کہ کیا میاں صاحب ہائی کورٹ میں کیس پلیڈ کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یور آنر... مجھے اگلی تاریخ چاہیئے کیونکہ میں نے وادیٔ برد غل میں ایک شب گزارنے جانا ہے... یا بقا ملتانی اپنے مزارعوں سے کہہ سکتا ہے کہ سائیں کپاس آپ خود کاشت کر لینا، میں بروغل کی برفیں دیکھنے جا رہا ہوں یا میں اپنے دوست اور ناشر سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ سوری نیاز احمد صاحب آپ کمال کے ناشر ہیں لیکن میں اس سوموار آپ کے ہاں مُرغی کے کباب اور دریائے راوی کے کھگے کھانے نہیں آسکتا اور میں فی الحال کوئی کتاب نہیں لکھنا چاہتا... کیونکہ میں....

ہاں ان علاقوں کی یہی مصیبت تھی کہ یہاں اب... یا کبھی نہیں ہوتا تھا۔

"تو بجاؤ سیٹی خالد ندیم اور پورٹرز کو اپنی طرف متوجہ کر کے واپس بُلا لو۔۔۔"

خالد جو ابھی ایک اونٹ کی طرح اداس تھا اب دو اونٹوں کی طرح اداس ہو گیا "آدھا گھنٹہ تو آپ بحث مباحثہ کرتے رہے ہیں اور پورٹر تو کب اس بلند گھاٹی کو پار کر کے پتہ نہیں کہاں پہنچ چکے ہیں ۔۔۔ نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں تو سیٹی بجانے سے فائدہ ۔۔۔ لیکن تارڑ صاحب آپ نے لاہور سے چلتے ہوئے میرے ساتھ ایک خفیہ وعدہ کیا تھا۔"

سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

"یہ کون سا خفیہ وعدہ ہے مائی لیڈر؟"

"اب چونکہ ہم یاک سرائے میں پہنچ چکے ہیں اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ میں آپ پر وہ عظیم الشان منصوبہ آشکار کر دوں جو ٹورازم کے ایک پوسٹر کو دیکھ کر میرے ذہن میں آیا تھا۔" میں نے قدرے جھینپ کر کہا

"آپ ہمیں داغِ مفارقت دے کر اس وادی میں چند یاک خرید کر کاشتکاری شروع کرنا چاہتے ہیں۔" نوید فوراً بولا کیونکہ میں نے اس عمودی چٹان کے بعد اسی قسم کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یوں بھی چودھری امیر بخش کے پوتے کی حیثیت سے اگرچہ یہ پوتا گاؤں کی دُھول کی بجائے شہر لاہور کی مال روڈ یا انگلستان کے ساحلی مقام ساؤتھ اینڈ کے آس پاس پلا بڑھا تھا لیکن بندے کی خصلت تو نہیں جاتی، اس کے جین تو وہی رہتے ہیں چنانچہ میں اس سفر کے دوران وادیٔ اشکومن میں یاسو تیج اور کرومبر میں کوئی بھی ہموار قطع زمین دیکھتا جس کے گرد سرد یلے پانیوں کی ایک ندی موجود ہوتی تو میں ایک سرد آہ بھر کر کہتا، نوید۔۔۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ یہاں کی مٹی کتنی قابل ہے، کتنی زرخیز ہے، پانی بھی موجود ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں کاشتکاری شروع کر دوں۔۔۔ اور نوید کہتا، تارڑ صاحب ہل کی ہتھی کو قابو میں رکھنا ایسے کہ ہل کا پھل زمین میں گہرا اُترے آپ کے لئے جوانی میں بھی ممکن نہ تھا تو اب آپ کیا کاشتکاری فرمائیں گے۔۔۔

"نہیں نہیں۔۔۔ میں ادھر آباد نہیں ہونا چاہتا۔ دراصل میں نے بہت عرصہ پہلے ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کا ایک اشتہاری پوسٹر دیکھا تھا جس میں ایک برفانی درّے کو چند لوگ یاکوں کی مدد سے عبور کر رہے ہیں۔ جب میں نے ذرا تفتیش کی تو معلوم ہُوا کہ یہ درّہ درکوت عبور کریں گے۔۔۔ دوسری طرف جائیں گے۔

"کیوں جی؟" خالد ندیم خوش ہو گیا۔

"اچھا دوسری طرف جا کر ہم یاکوں کا کیا کریں گے؟۔۔۔ ڈیری فارم بنائیں گے؟" خالد ملتانی کے لبوں پر ایک خبیث مسکراہٹ تھی۔

"نہیں۔۔۔" میں بھی مُسکرانے لگا لیکن قدرے خجالت سے کیونکہ میں نے یہی سوال۔۔۔ یعنی ہم دوسری جانب اُتر کر یاکوں کا کیا کریں گے۔ اشرف امان سے پوچھا تھا جس نے مجھے اس یاک رائڈ کا مشورہ دیا تھا۔

اشرف امان اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں آپ کی آنکھوں کے سامنے بند کر کے مسلسل بولتا ہے اور ایک مشہور کوہ پیما کا کہنا ہے کہ وہ کے ٹو پر چڑھتے ہوئے پورا سامان اٹھائے آکسیجن کی کمی کے باوجود بھی اسی طرح بولتا جا رہا تھا۔ "تارڑ صاحب میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ بروغل پہنچ کر تین یاک خرید یں۔ ان دنوں ایک اعلیٰ نسل کا یاک چھ ہزار میں مل جائے گا۔ اس پر

سامان رکھیں اپنے آپ کو رکھیں۔ درّہ درکوٹ کراس کریں اور دوسری جانب اُتر جائیں۔"

دوسری جانب اتر کر میں یاکوں کو لاہور لے جاؤں اور گلبرگ والے گھر میں استاد اللہ بخش صادقین اور خالد اقبال کی تصویروں والے کمرے میں باندھ دوں؟" میں نے ذرا بیزار ہو کر کہا تھا۔

"نہیں نہیں" اس نے چٹکی بجا کر کہا تھا "تینوں یاک گلگت جا کر بیچ دیں۔ دو ہزار روپے فی یاک منافع ہو گا۔"

اور میں نے ایک اور اعتراض کیا تھا۔ اشرف امان دراصل مجھے یاک فروخت کرنے کا زیادہ تجربہ نہیں تو میں گلگت کے بازار میں لوگوں کو کیسے متوجہ کروں گا... یاک فروخت کرنے کے لئے کس قسم کی آواز لگاؤں گا... یاک لے لو یاک... درّہ درکوٹ کا آزمائش شدہ... پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یاکوں کی لوٹ سیل وغیرہ ....

تو بس یہی منصوبہ تھا اور یہی گفتہ وعدہ تھا جو میں نے خالد ندیم سے کیا تھا "بالکل یہ وعدہ پورا ہو گا"... یہاں سے کچھ فاصلے پر کم اونیل کے نقشے کے مطابق...

"کس کے نقشے کے مطابق؟" پوری ٹیم چونکی ہو گئی۔

"کم اونیل نے گلگت میں کہا تھا..."

"ہائے ہائے کس ظالم کا نام لے دیا ہے" میاں صاحب جذباتی ہو گئے۔ "اور کس مقام پر اس کا نام لے دیا ہے... تو کیا کہا تھا کم بی بی نے؟"

"اس نے کہا تھا کہ کرومبر کے بعد چرواہوں کے جھونپڑے آئیں گے پھر تین چھوٹے چھوٹے داخی گاؤں دکھائی دیں گے جن میں سے ایک کا نام توپ خانہ ہے اور وہاں بہت آبادی ہے اور بہت شاندار جگہ ہے۔ کم از کم دو دن قیام کرنا اور وہیں سے یاک بھی دستیاب ہو جائیں گے۔"

"ہائے کم اونیل" نوید نے بھی اِک آہ سرد بھری حالانکہ بچہ تھا اور ایک عدد منگیتر رکھتا تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں پوری ٹیم کم اونیل کے نام یا کٹی یاک ہو جاتی تھی۔

شاہد صاحب بھی کھانس کر شامل ہو گئے۔ "مائی لیڈر اس شب گلگت میں اگر آپ ہمیں بھی ساتھ لے چلتے تو ہم بھی اُس نیک سیرت بی بی کا دیدار کر لیتے۔"

مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی ریاست نوادا میں رینو کے شہر میں مقیم کم اونیل اگر یہ جان سکتی کہ اس لمحے وادیٔ برّوغل میں چند پاکستانی کوہ نورد صرف اس کے نام کی دلکشی میں مبتلا ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں تو وہ سر جھٹک کر کہتی "میڈ پیپل" اور ذرا خوش بھی ہوتی۔

ہم اپنے اپنے رُک سیک اٹھا کر بلندی سے نیچے وادیٔ برّوغل کی فوم کی طرح نرم گدیلی گھاس بھرے سحر میں اترنے لگے جہاں اس میں پوشیدہ ندیوں کے کنارے سبز کائی جمی ہوئی تھی اور کہیں کہیں پیاز کے ڈنٹھل بلند ہوتے تھے۔ تیر کی طرح بلند ہوتے سِٹے دار زرد پھول اور بڑے بڑے سُرخ پتوں کے ڈھیر تھے اور کہیں کہیں دھوپ تھی اور کہیں سایہ تھا اور جہاں سایہ تھا وہاں گھاس تاریک ہوتی تھی۔

ہم سب اب یاکوٹ یاک ہو چکے تھے یعنی یاکوں کے خواب دیکھ رہے تھے۔۔۔ اشرف امان نے یہ بھی کہا تھا کہ یاک کی پُشت ایک سلور مرسیڈیس کی نشست سے بھی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے اور وہ گلیشیئر پر چلتے ہوئے جان جاتا ہے کہ کہاں کریوس ہے، برف کی دراڑ ہے اور یہ وہ اپنے سُموں کی دھمک سے جان جاتا ہے اور وہیں کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ایسے ترچھے اور بلند راستوں پر بھی چل سکتا ہے جہاں چیونٹی بھی رینگنے سے پہلے سوچتی ہے اور شاید چیونٹی گر جائے لیکن یاک نہیں گرتا۔۔۔ بہر حال یہ اشرف امان نے کہا تھا۔

ہندوکش کے واٹر کلر پہاڑی سلسلے کے دامن میں ایک جھیل پتھروں کی نیلاہٹ سے الگ ہو کر صبح کے سورج کی سفیدی میں سفید ہو رہی تھی۔

پامیر کی یاک سرائے میں۔۔۔ ہزاروں یاک اگرچہ ایک ناقابلِ یقین اونچائی سے نیچے وادی کی ہریاول میں رینگتے ہوئے ہمیں دیکھتے تھے اور پتہ نہیں ہمیں کیا سمجھتے تھے لیکن ہم انہیں یہاں سے دیکھتے تھے تو یاک ہی سمجھتے تھے۔

وادیٔ بروغل میں اُس صبح کی مسرت انگیز اور نوجوانی کا بخار بھر دینے والی واک کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔۔ بوڑھی انگریز مائیاں اگر شدید برفباری کے دنوں میں سورج کی ایک جھلک دیکھ لیں تو ان کی مسرّت کا اظہار "اِزن اِٹ لَولی" کی صورت میں ہوتا ہے۔ میں بھی اس وُسعت میں واکنگ سٹک ٹیکتا۔۔۔ ندیوں کو پھلانگتا۔۔۔ ہندوکش اور پامیر کی سرد ہواؤں میں گہرے اطمینان بخش سانس کھینچتا۔۔۔ اپنے سامنے پھیلی چراگاہوں کو حیرت سے تکتے یہی کہہ سکتا تھا کہ۔۔۔ اِزن اِٹ لَولی! کاش میں یاک ہوتا۔۔۔ یا شاید میں تھا اس لئے تو ہری ہری گھاس کو حسرت سے دیکھتا تھا۔ صرف یاک ہی نہیں تھے، پامیری بھیڑوں کے بے انت گلے بھی تھے جو اونچائیوں پر گھاس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سورج سر پر آیا تو ہم دوپہر کے کھانے کے لئے رُک گئے۔۔۔ ایک ایسی چراگاہ کی قربت میں جہاں ایک ٹھنڈی ٹھار ندی بہتی تھی اور اس کے کنارے متعدد یاک تھوتھنیاں اٹھائے اپنی مورچھل دُمیں جھلتے، ہمیں ان نظروں سے دیکھتے تھے جن نظروں سے ان کے بھائی بندوں نے بقا ملتانی کو دیکھا تھا۔۔ چونکہ وہ کلوز رینج میں تھے اس لئے یاکس کی متعدد کلوز اَپ پورٹریٹس بنائی گئیں۔

تین خستہ حال واخی نقوش کے چرواہے ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے انہیں چائے کی پیش کش کی لیکن ان کی نظروں میں جو حیرت اور تعجب تھا۔ وہ نہیں جاتا تھا۔ یہ واخی نسل کے چرواہے ایسے تھے کہ ازبکستان، تاجکستان اور افغانستان آنا جانا ان کے معمول میں شامل تھا، بلکہ وہ بہت زیادہ آگاہ نہیں تھے کہ یہ غیر ممالک ہیں۔ ان کے لئے چراگاہیں چاہے ازبکستان میں ہوں افغانستان کی واخان پٹی میں ہوں یا پاکستان کی وادیٔ بروغل میں ہوں، چراگاہیں تھیں جن میں وہ اپنی بھیڑیں اور یاک چرا سکتے تھے۔ ان کی حیرت کی وجہ بھی معقول تھی۔ انہوں نے غیر ملکی کوہ نوردوں کو تو کبھی کبھار دیکھ رکھا تھا لیکن ہم جیسے تھلیلے ہوتے چہروں والے پاکستانیوں کی شکلوں سے وہ بہت کم واقف تھے۔۔۔ صرف اشاروں کنایوں میں گفتگو ہوئی لیکن ہم نے بھی کچھ نہ کہا اور وہ بھی کچھ کہہ نہ سکے۔

کھانے کے بعد فوراً ایک اور میدان آیا۔۔۔ ہوا کی سرسراہٹ اور گھاس کے میدانوں کی تنہائی میں ندیوں

کے بہاؤ سے الگ کچھ اور آوازیں سنائی دیں ... ایک پتھریلی آبادی نظر آئی جس کے سامنے ایک ہموار سطح پر کوہ پامیر کی ڈھلوانیں جہاں ختم ہوتی تھیں، وہاں ایک خیمہ بستی آباد تھی ... گھاس کی ہریالی پر ایستادہ ... جن کے رنگ شوخ اور بکھرے ہوئے تھے۔ آؤ لڑیں اور قریب آئیں ... ہم ایک پامیری نالے کے بلند کنارے پر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے اس نالے کے دونوں طرف پتھروں کے بے ڈھنگے اور بلند سے گھر تھے۔ چھتوں پر سرخ اور زرد رنگوں کے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس نحیف مگر دمکتے ہوئے بچے ہمیں دیکھتے تھے لیکن بہت زیادہ دلچسپی کے ساتھ نہیں ... ہم بلند کنارے سے نیچے اترے۔ سنبھلتے ہوئے اور بجری پر پھسلتے ہوئے نالے کے کناروں پر۔ اور یہ کنارے جنت سے گدلے تھے۔ وہاں متعدد عورتیں پتھروں پر کپڑے پٹخ پٹخ کر دھو رہی تھیں ... انہوں نے بھی ہمیں دیکھ کر نہ تعجب کا اظہار کیا نہ حیرت کا اظہار ... اور نہ ہی اپنے چہرے ... جو کہ دیکھنے تھے ہم سے پوشیدہ کرنے کی کوشش کی بلکہ ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنے کام میں مگن رہیں ... ہم اس تیز نالے میں سر نکالے ابھرتے ہوئے چکنے پتھروں پر بہت احتیاط سے قدم رکھتے ... بہت ڈھلتے اور پھسلتے ہوئے پار ہو گئے۔ دوسری جانب بلند کنارے تک باریک بجری کی چڑھائی تھی جس پر قدم ایک رکھتے تھے اور قدم دو پیچھے آتے تھے اور جب ہم کشاں کشاں اوپر آئے تو سامنے وہ میدان تھا جس کے ایک کنارے پر رنگا رنگ خیموں کا ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گاؤں آباد تھا ... خیمے بالکل نئے نکور اور انہیں [illegible] کر دینے والی حد تک صاف ستھرے اور منظم تھے ... قدرت کی بے ساختگی کے بیچ میں یہ انسانی ساخت نگاہ کو عجیب لگتی تھی اور ان خیموں کے آس پاس جاپانی بابا لوگ ٹہلتے تھے ... ان میں ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ بابا لوگ کون سے ہیں اور بابی لوگ کون سی ہیں۔

ہم سب تو جنگل کے باسی ہو چکے تھے۔ ویرانے ہمارے ضمیر میں گندھے جا چکے تھے۔ پچھلے چھ سات روز سے نہ ہم نے کسی کو دیکھا تھا اور نہ ہمیں کسی نے دیکھا تھا ... سوائے یوتو کے گھوڑوں کے اور یاکوں کے ... چنانچہ ہم سب سیاہ "بلیک بک" ہرنوں کی طرح یکدم ٹھٹھک گئے جو صحرا کی ویرانی اور تنہائی میں کئی دنوں سے چوکڑیاں بھرتے آئے تھے اور اس کی وسعت میں کسی کو شریک نہ کرتے تھے اور ایک دم اپنے سامنے ایک شہر آباد دیکھ کر ٹھٹھکے تھے کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اور خوفزدہ ہوتے تھے۔

دیویندر اسّر کی نئی کتاب

ادب کی آبرو

- احساس مرگ، لکھنا مستقبل کا، جدیدیت تحریر ثانی، مابعد جدیدیت، نظریہ اور فریب نظر، سعید کا گلوبل ناول، تہذیب کی تعریفات، میڈیا کلچر اور پاپولر کلچر اور دوسرے موضوعات پر گہری تحلیلی بحث
- مابعد جدیدیت اور نئی اقدار اور تہذیبی سوچ کا منظر نامہ
- سائنس، سماج، تہذیب اور تخلیق کے اشتراک اور عمل کے بدلتے تصورات کا جائزہ۔
- نئی صدی کی دہلیز پر ابھرتے سوالات

صفحات ۲۳۰ قیمت [illegible] روپے

پبلشرز: نیشنل ایڈورٹائزرز ... کرشن نگر دہلی

آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں

بشریٰ اعجاز

دل کی باتیں:

باتوں کے دوران وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ کار ایک پُر رونق بازار سے گزری تو میں نے دیکھا ہم انبالہ سے گزر رہے ہیں بچپن میں ہماری امی سرگودھا کی ایک مشہور دکان سے کپڑا خریدا کرتی تھیں۔ اس دکان کا نام انبالہ کلاتھ ہاؤس تھا۔ میں ان کے ساتھ وہاں اکثر جایا کرتی تھی۔ اس دکان کا مالک مجھے میری گڑیوں کے لئے کپڑے کے مختلف تھانوں سے پاؤ پاؤ آدھ گز پیس اتار کر دیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ ہمیشہ مجھ سے پوچھتا بیٹا کس تھان سے پھاڑوں؟ اور میں عموماً لال بروکیڈ اور گولڈن ساٹن چنا کرتی تھی۔ بچپن کی یاد کے حوالے سے انبالہ کا نام میرے حافظے میں بہت پہلے سے محفوظ تھا۔ وہاں پہنچ کر میرا دل چاہا کہ میں کچھ دیر یہاں رکوں، کچھ دیکھوں، کچھ محسوس کروں، شاید حافظے میں محفوظ وہ نام حقیقت بن جائے۔ شاید میں پھر وہی چھوٹی سی بچی بن جاؤں کہیں آسمانوں سے اتر کر وہ خوب صورت عورت آ جائے جس کی یاد اب دل سے ٹیس بن کر اٹھتی ہے جو کالا برقعہ پہنے، دوہرا نقاب منہ پر گرائے، مجھے انگلی سے لگائے خراماں خراماں بازار سے گزرتی انبالہ کلاتھ ہاؤس کے دروازے تک پہنچے تو میں ضد کر کے دکان کے سامنے کھڑے قلفی والے سے چار آنے کی املی کھوئے اور بالائی والی قلفی خریدوں اور اپنے مزے مزے سے چوستی دکان کے شوکیس میں سجے قیمتی کپڑے دیکھتی جاؤں یا اللہ خواب اور خواہشیں مٹھی سے گر کیوں جاتی ہیں؟

بازار میں عورتیں سائیکل پر کیریر باندھے مزے سے سودا سلف خریدتی پھر رہی تھیں، بعض نے دو دو بچے بھی ساتھ بٹھا رکھے تھے۔ میرے لئے یہ نئی بات تھی مگر وہاں کے لوگوں کے لئے بالکل نہیں۔ جبھی تو وہ آزادانہ گھوم پھر رہی تھیں۔ کوئی آنکھ ان کی طرف نہیں اٹھ رہی تھی۔ کوئی نظر ان کے وجود پر نہیں بھنبھنا رہی تھی۔ حالانکہ ان میں سے کئی دوپٹے کے تکلف سے بھی آزاد تھیں۔ بازار کے دائیں جانب ایک عمارت کی پیشانی پر بڑا بڑا لکھا تھا "سناتن دھرم کالج لاہور"۔ میں حیرت سے وہ عبارت دیکھ رہی تھی۔ باقی سب تو ٹھیک تھا مگر لاہور کی وہاں موجودگی میری سمجھ سے باہر تھی۔ پھر مجھے خیال آیا جیسے سرگودھا میں انبالہ کلاتھ ہاؤس دہلی کلاتھ ہاؤس اور کپور تھلہ جیولرز موجود ہیں۔ اسی طرح انبالہ میں کیا سناتن دھرم کالج لاہور نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ تقسیم سے علاقائی سرحدیں تو مقرر کی جا سکتی ہیں، مگر جذباتی حدیں مقرر کرنا کسی بھی تقسیم سے ممکن نہیں۔ انبالہ سے ہجرت کرنے

والے، اپنا چھوٹا سا انبالہ ساتھ لے گئے اور انہوں نے سرگودھا کے امین بازار میں جا کر بصد محبت اسے آباد کر دیا۔ سناتن دھرم کالج والے لاہور سے جاتے وقت اپنا پیارا لاہور ساتھ لے گئے اور انہوں نے اسے انبالہ کی مصروف سڑک پر سجا دیا۔ دیکھئے والے جو بھی کہیں، دل والے تو یوں ہی کرتے ہیں۔

سفر میں دور تک :

مجھے بھی بھوک لگی تھی اور کیفی صاحب بھی تھوڑی ریفریشمنٹ کرنا چاہتے تھے۔ ہماری کار بڑے بس سٹاپ کے قریب رُکی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی عمارت پر پورن سنگھ ۔ دشال ڈھابا کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہاں ایک دو راہگیروں نے بتایا کہ پورن سنگھ دشال ڈھابا اپنے لذیذ کھانوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ لوگ دُور دُور سے یہاں کھانے کے لئے آتے ہیں۔ میں نے انڈیا میں سب سے ڈھابوں کے کھانے کی تعریف سُنی تھی۔ اس وقت سوئے اتفاق ایک مشہور و معروف ڈھابا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اب اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا زیادتی تھی۔ کیفی صاحب سے کھانے کا پوچھا تو کہنے لگے، میں خشک میٹ کھاؤں گا۔ ساتھ میں اگر لسّی کا گلاس مل جائے تو بہت اچھا ہے۔

ڈھابے کا ماحول بالکل لکشمی چوک والے ریسٹورانوں جیسا تھا۔ چپس کے فرش پر جا بجا پانی نظر آ رہا تھا۔ نزدیک نزدیک رکھی ہوئی میزوں کے گرد سردار اور سردارنیاں بمعہ بچگان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بیروں کی بھاگ دوڑ، بچوں کے رونے کی آوازیں اور سرداروں کا اونچی آواز میں کھانے کا آرڈر دینا اور بے ہنگم آوازیں کیسٹ ریکارڈر کا بجنا — "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق" جیسا تھا۔ بلی اور روشنی مجھے بار بار کہیں اور جانے کے لئے کہہ رہی تھیں مگر میں کہیں اور جا کر کھانے کے موڈ میں نہ تھی۔ اس لئے کہ میرے لئے وہ ماحول کچھ اتنا نامانوس بھی نہ تھا کیونکہ اس طرح کا شور شرابا ہماری شہری زندگی کا حصہ ہے اور ہم لوگ اس کے خاصی حد تک عادی ہیں، اور پھر کسی ملک کی عوامی زندگی کا اصل رنگ تو نظر ہی ایسی جگہوں پر آتا ہے اور میں وہی رنگ دیکھنا چاہتی تھی۔

بنگالی بیرے سے مینو کا پوچھا تو وہ کندھے پر پڑے ہوئے میلے رومال سے گیلے ہاتھ خشک کرتا ہوا جلدی جلدی ایک ہی سانس میں بولا۔ چکن کری، چکن مصالحہ اور قیمہ پلاؤ ہے۔ ساتھ میں روٹیاں، لسّی اور ڈرنکس ہیں۔ میڈم آپ کے لئے کیا لاؤں۔ روشنی اور بلی چونکہ VEGETARIAN تھیں لہٰذا انہوں نے سادہ چاول اور دال منگوائی اور ہمارے لئے چکن مصالحہ اور قیمہ پلاؤ کا آرڈر دیا۔ کیفی صاحب کے لئے لسّی کا آرڈر دیتے وقت میں نے اپنے لئے بھی منگوا لی میٹل کے ہاتھ بھر لمبے گلاس میں دہی کی گاڑھی جھاگ جھاگ ٹھنڈی سی۔ ویٹر نے میرے سامنے لا کر رکھ دی۔ لسّی کے سِپ لیتے ہوئے میری آنکھوں میں تخت ہزارہ، آم کے نیچے بیٹھی نانو اور کانسی کے ہاتھ بھر لمبے قلعی شدہ گلاس میں تازہ رڑھکی ہوئی، کڑھے ہوئے دودھ کی لال لال لسّی لاتی فاطمہ تیلن گھوم گئی۔ نانو کے اونچے چوبارے کے بنیرے پر بیٹھا کاگا ہمجولیوں کو کاں کاں کر کے بلانے لگا۔ فاطمہ تیلن نے لسّی کو چھان کر کڑھے ہوئے دودھ کا پھوک، ہاتھ میں پکڑ لیا، کاگا اس کے سر پہ کائیں کائیں کرتا ہوا منڈلانے لگا۔ فاطمہ نے پھوک (جسے ہم پون کہتے ہیں) صحن میں ایک طرف اچھال دیا

اور خود جھونا ڈھاک پر رکھ کر کھرے کی طرف بڑھ گئی۔ نانو نے تام چینی کی پلیٹ میں اُبلی ہوئی گھر کی سویوں پر تازہ موٹے رنگی خوشبودار شکر ڈالی۔ مکھن کا مُنا سا پیڑا اس کے اوپر رکھا اور چوکور چمچ (جسے وہ کاشک کہتی تھیں) پلیٹ میں رکھ کر مجھے پکڑا دی۔ آم کے گھنے درخت کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں کا مزا اور نرمی شاید نانو ہی کی وجہ سے تھی، ورنہ آم کا پیڑ تو اب بھی وہیں ایستادہ ہے، مگر چھاؤں دھوپ جیسی ہو گئی ہے۔ اک چھوٹی سی بچی کلر فل فراک اور پاؤں میں چمکیلی گرگابی پہنے، اکثر آم کے درخت کے نیچے تنہا کسی کے انتظار میں بیٹھی مجھے نظر آتی ہے۔ کبھی وہ کاگا کے سنگ نانو کے اونچے چوبارے کے بنیروں کے نیچے جھانکتی دکھتی ہے اور کبھی کچے کوٹھے کی الماری سے، جھیرے کی دیسی گھی والی پھیونیاں چوری چوری نکال کر اس سوچ میں ڈوبی نظر آتی ہے کہ انہیں کھاؤں کیسے۔

وہ بچی مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔ بہت ضدی ہے وہ۔ اکثر بھیڑ بھاڑ میں مجھ سے کھو جاتی ہے۔ پھر میں اسے تلاش کرنے میں لگ جاتی ہوں۔ اس کی تلاش کا سفر اکثر مجھے دور دراز کی بھولی بسری یادوں کے علاقے میں لے جاتا ہے، جہاں گزری رتوں کے کھنڈر ابھی تک موجود ہیں۔ وہ بچی عموماً مجھے انہی کھنڈرات میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ پتہ نہیں اسے کس کی تلاش ہے اسے وہاں سے واپس لانے میں مجھے بہت دقت پیش آتی ہے۔ کبھی مانتی ہے کبھی انکار کر دیتی ہے۔ پھر اسے بہت منتوں سے واپس لانا پڑتا ہے، اس لئے کہ مجھے بھی اس کی ضرورت ہے۔

شنی کے روز شنی مہاراج :

پورن سنگھ وشال ڈھابے کا کھانا واقعی لذیذ تھا۔ ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ باہر آئے تو اک اُدھیڑ عمر مزدور پیشہ آدمی ہاتھ میں سلور کا ڈول پکڑے شنی مہاراج سکھ شانتی۔ ـــــــــــــ

ـــ شنی مہاراج سکھ شانتی کی صدائیں لگاتا ہمارے سامنے سے گزرا۔ تھوڑا آگے جا کر پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہمارے قریب آگیا۔ میڈم شنی مہاراج کے سیوک کو کچھ دان کریں گی۔ روشنی اور ببلی نے اس کی سنی اَن سنی کر دی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ڈول کی طرف دیکھا تو مجھے اس میں پانی کی جگہ کچھ اور نظر آیا۔ "اس ڈول میں کیا ہے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "میڈم شنی مہاراج ہیں"۔ وہ بڑے ادب سے بولا۔ دکھاؤ۔ میں نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ڈول نیچے رکھ دیا اور خود بھی اکڑوں زمین پر بیٹھ گیا"۔ آیئے میڈم"۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ڈول کے پیندے میں پانی تھا جس میں اٹھنیاں، چونیاں اور روپے کے سکے ڈوبے پڑے تھے۔ ڈول کا پیندا ان سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک ہاتھ بھر مورتی تھی جس کو پیلے اور نارنجی رنگ کے گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ مورتی کے ارد گرد اگربتیاں جل رہی تھیں اور یوں جل اور مایا کے اوپر اگربتیوں کا خوشبودار دھواں پھانکتے شنی مہاراج مزے سے کھڑے مُسکرا رہے تھے۔ "شنی مہاراج کون تھے؟" میں نے ڈول والے سے بصد عقیدت پوچھا۔ "میڈم شنی مہاراج بس شنی مہاراج ہیں"۔ ڈول والے کا جواب معصومیت سے بھرا ہوا تھا۔ "یہ تو مجھے پتہ ہے شنی مہاراج بس شنی مہاراج ہیں مگر ان کی کوئی خاص صفت، کوئی خوبی بتاؤ" ـــ "میڈم یہ شنی وار کے بھگوان ہیں۔ شنی وار ان کا دن ہے۔ میں ہر شنی وار کو ان کے دان کے لئے نکلتا ہوں"۔ "اچھا یہ تو بتاؤ

تمہارا نام کیا ہے اور اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟ "جی میں نرائن لال ہوں اور رکشہ چلاتا ہوں" اپنا رکشہ یا کرائے کا؟" میڈم ہمارے پاس اپنا رکشہ نہیں ہے۔ ہم تو بس دیہاڑی دار ہیں" کتنا کما لیتے ہو؟" جی تقریباً بیس پچیس روپے روز کے بن جاتے ہیں۔" اور شنی وار کے دن؟" میڈم شنی وار کو تو مہاراج کی کرپا سے اسی نوے روپے جمع ہو جاتے ہیں" میڈم یہ ہمارا باپ دادا کا پیشہ ہے۔ اگر ہم نہ مانگیں تو برکت نہیں ہوتی۔ ہمارے خاندان کے سارے مرد شنی وار کو مہاراج کے دان کے لئے نکلتے ہیں۔" میں نے پرس کھول کر اس میں سے تمام ریزگاری چن کر نکالی اور شنی مہاراج کے سر سے وار کر ڈول میں ڈال دی۔ اتنے سکے دیکھ کر نرائن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بے اختیار اس کے منہ سے دعا نکلی جو اس کے بقول خاص خاص لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔

شنی مہاراج سکھ شانتی

راضی رکھے رنگ لاوے

اوم شیتو جیشو نما

(جاری)

"الفاظ"

معروف شاعر صاحبزادہ رفعت سلطان کا ساتواں مجموعۂ کلام "الفاظ" کے نام سے شائع ہو گیا ہے

برائے رابطہ، باھو کاٹیج، رانا کالونی جھنگ صدر

فون : ۹۲۰۱۴۰ / ۷۱۴۳۰

اعلیٰ ملازمتوں میں مقابلے کے امتحانات اور ایم اے (اردو) میں اعلیٰ کامیابی کی ضامن ڈاکٹر انور سدید کی کتابیں

۱۔ اردو ادب کی تحریکیں (تیسرا ایڈیشن) قیمت ۷۵ روپے

۲۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ (دوسرا ایڈیشن) قیمت ۱۵۰ روپے

پیشگی قیمت بھیج کر ڈاک خرچ اور ۱۵ فیصد رعایت پر اب اس پتے پر بھی دستیاب ہیں

مصنفین ۲۰-۷ اسٹیج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور (۵۴۵۷۰)

کراچی میں تخلیق ملنے کا پتہ

دانشکدہ ۴ زہرہ سکوائر - راشد منہاس روڈ - گلشن اقبال بلاک ۴ کراچی ۷۵۳۰۰

حقیقت نگار مصوّر اور شاعر

★ ——— ایمن ہاشمی

نصیر الدین شیخ کو موقلم اور رنگوں سے رشتہ استوار کیے بظاہر ابھی چند برس ہی ہوئے ہیں لیکن درحقیقت وہ مصوری کا آغاز کافی عرصہ پہلے سے کر چکے ہیں۔ انہیں اپنی اس صلاحیت کو منوانے کا ادراک بچپن ہی میں ہو گیا تھا لیکن گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہ تصویر کشی کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ سُنا یہی ہے کہ شوق کی چنگاری کبھی بجھنے نہیں پاتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ انہیں بھی درپیش آیا۔ ایک بار انہیں نامور مصوّر جناب سعید اختر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ انہیں جب کام کرتے دیکھا تو شوق کی چنگاری جو دبی ہوئی تھی، بھڑک اٹھی۔ پھر وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے باقاعدگی سے سعید اختر کے ہاں جانے لگے اور اپنی بنائی ہوئی تصویروں پر اُن سے اصلاح لینے لگے۔

یوں تو نصیر الدین شیخ نے باقاعدہ طور پر مصوری کا آغاز اپنی زندگی میں بہت دیر سے کیا تھا۔ بقول ان کے انہوں نے اپنی پہلی پینٹنگز اوجڑی کیمپ کے حادثے سے متاثر ہو کر بنائی۔ اس بات کو کم و بیش دس بارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ بات میں اپنے پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ نصیر صاحب کو پینٹنگز کے سلسلے میں کافی حد تک لگاؤ رہا ہے۔ اور انہوں نے اپنے اس شوق کو جاری و ساری رکھنے کے لئے دنیا کے تمام ممالک کے مشہور میوزیم کو دیکھنے کا شوق بھی پورا کیا۔ خاص طور پر اٹلی، فرانس، سپین، امریکہ اور لندن ——— ان آرٹ گیلریوں میں رکھی ہوئی معرکۃ الآراء تصاویر کا چشم دید مطالعہ بھی کیا۔ خاص کر ان میں امریکہ کے شہر واشنگٹن اور نیویارک کی نیشنل گیلری، اٹلی کے شہر روم اور وینس کی آرٹ گیلری پادوا (PADUA)، سپین کے شہر میڈرڈ کا میڈرڈ آرٹ میوزیم، لندن شہر کی مشہور نیشنل آرٹ گیلری، اور میوزیم آف ماڈرن آرٹ، فرانس کے شہر پیرس کی دلکش اور ممتاز میوزیم آف آرٹ گیلری قابلِ ذکر ہیں۔

نصیر الدین شیخ نے اپنے فن میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لئے نامور مصوّروں کے فن پاروں کو اکٹھا کرنے کا شوق بھی کیا لہٰذا اس شوق کی اُمنگ کے لئے انہوں نے خالد اقبال کے لینڈ سکیپ، معین نجمی کی اندرون شہر کی پینٹنگز، سعید اختر کے پورٹریٹ اور نذیر احمد کے لینڈ سکیپ خریدے اور مابعد جب ان نامور مصوّروں سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے جواباً کچھ تحائف بھی دیئے۔ بقول نصیر الدین شیخ انہوں نے یہ تصویریں بہت ہی محبت اور لگن سے بنائی ہیں، کیونکہ کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا جب تک کہ فنکار اپنی روح کے تاروں کو نہیں چھیڑتا اور ان میں اپنا خونِ جگر شامل نہیں کر لیتا۔

نصیرالدین شیخ کی پینٹنگز خواہ وہ تجریدی ہوں یا لینڈ سکیپ (LAND SCAPES) ، ان میں حرکت کا عنصر قدرِ مشترک بن کر اُبھرتا ہے ، ان کی STROM SERIES میں جہاں ان کا کینوس بہت وسیع ہے وہاں یوں لگتا ہے کہ یہ ساری کائنات کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں ، حقیقت یہ ہے کہ ان کی تمام تر پینٹنگز میں حرکت کا عنصر شدت سے نمایاں نظر آتا ہے ، اسی طرح ان کے لینڈ سکیپ کے بادلوں اور درختوں میں اکثر طوفانی تند و تیز ہوا کا احساس بھی ہوتا ہے ، جو بات ان کو باقی مصوروں میں نمایاں کرتی ہے وہ ان کے رنگوں کا چناؤ اور ان کا استعمال ہے . ان کے رنگ بہت ہی PURE ہیں . ان سے بالیدگی ، صفائی ، محبت اور نفاست ٹپکتی ہے .

نصیرالدین شیخ کے فن پاروں کو دیکھ کر قدیم ہندوستان کے شعری پیکر زندہ ہو جاتے ہیں ، کالی داس نے میگھ دوت لکھ کر گویا اس زمیں کے چاروں موسموں کو زبان عطا کی تھی . اسی طرح نصیرالدین شیخ نے بھی اپنے فن پاروں میں اسی اسلوب کو اپنا کر دوبارہ زندۂ جاوید بنا دیا ہے . رنگ جو موسموں کے پہچان کی علامت ہوتے ہیں . جیسے خزاں کا پیلا رنگ جو ماتھے کی اُڑی ہوئی رنگت سے مماثلت رکھتا ہے ، یا سرسوں کے پھول ، اس کے ہر جزو کے ساتھ ساتھ بہار و خزاں کے رنگوں کو بھی بھرپور انداز میں سجایا گیا ہے .

نصیرالدین شیخ کی جرأت آمیز ، حیرت افزا ، اور بھرپور قوت سے مملو ایسی تصویریں ہیں جن میں اچھوتے طرز اور ایک نئے سٹائل کا بندھن بھی ہے . مون سون کے چھائے ہوئے بادل بھی ، متوقع بارش کے آثار بھی ، اور پانیوں کے جوہڑ کا سرمئی پن بھی . ان تصاویر میں فن کار اپنی صلاحیتوں اور قوت نمو کا اظہار بھی کرتا ہے . خاص طور پر مون سون کی بدلتی ہوئی کیفیات اور نیلگوں آسمان کے پُرکشش نقش و نگار کو مختلف رنگوں کی آمیزش سے ، اسی طرح ان کی پینٹنگز میں جو بے ساختگی کا عنصر ہے ، وہ ان کی اپنی روح کے محسوسات کی عکاس ہے یعنی جو کیفیت روح نے محسوس کی اُسے اپنی طرز پر رنگوں میں سمو دیا .

میں سمجھتا ہوں کہ نصیرالدین شیخ کی پینٹنگز کو خانوں میں بانٹنے کا عمل ایک اکیڈیمک ہے جو محض ظاہر کی پُرکاری کی حد بندی کرنے کا نام ہے ، وہ روح جو ان میں جاری و ساری ہے ان کی پیاس کا حدود اربعہ دیکھنے کے لائق ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی گرفت میں لینے پر قادر ہے ، اور جس شے پر بھی وہ نظر ڈالتے ہیں ، اس پر اپنے طرزِ احساس اور سوچ کی گویا مہر ثبت کر دیتے ہیں لیکن جو چیز ان کی توجہ کا زیادہ تر مرکز بنی ہوئی ہے وہ زمین اور اس کے آثار ہیں . انسان کے لئے اس کی پہلی اور آخری حقیقت اس کے قدموں کے نیچے زمین اور اس کے سر پر کھلا آسمان اور درخت ہیں ، انسان اور اس کی دنیا ایک فن کار کی نظر میں اپنی دُوئی مٹا دیتی ہے ، اور وہ یک جان و یک قالب ہو جاتی ہے ، ان تصویروں کے باطن میں جو سوچ و فکر مضمر ہے ، غالباً اس کا ایک گوشہ اس وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کو نمایاں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور یوں یہ تصویریں صرف جاذبِ نظر ہی نہیں بلکہ ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ بھی کرتی ہیں . بلکہ ایک لمبے عرصے تک اس طلسم میں گرفتار بھی رکھتی ہیں . یہی ایک اچھے اور منجھے ہوئے فن کار کی خوبی ہے .

نصیرالدین شیخ کی مصوری کے تمام پہلوؤں پر بات ہو گئی . ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے

دیکھئے کہ یہ میرے مقابلے میں زیادہ مستند ہوگی۔ وہ کہتے ہیں، " نصیر الدین شیخ ہمہ وقتی شاعر نہیں، وہ ہمہ وقتی مصور بھی نہیں۔ ان کے کلام اور ان کی تصاویر میں وہ روایتی اثرات نہیں جو ادبی گروہ بندیوں اور مصورانہ چشمکوں سے در آتے ہیں۔ وہ مزاجاً درویش ہیں، صلے اور داد کے طالب نہیں نہ انہیں ایسی پیشہ ورانہ گروہ بندیوں کی ضرورت ہے جس کے لئے شاعر مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے ادب ہمہ وقت کا اوڑھنا بچھونا نہیں، بلکہ فارغ وقت کا مشغلہ ہے"۔ وحید قریشی مزید لکھتے ہیں :-

"ان کی نظموں اور غزلوں میں ازل اور ابد کی تمثال گری ایک سے زیادہ جہتوں کی یاد دلاتی ہے۔ انہوں نے زندگی کی مشکلات ہی سے جمالیاتی حسن کشید کیا ہے۔ جمال پرستی اور انسان دوستی کے تانے بانے نے انہیں زندگی سے محبت اور انسانوں سے پیار کا درس دیا ہے ۔ وہ غالب کے کلام کے شیدائی ہیں ۔ جدید شاعروں میں فیض کے کلام نے اُن کے ہاں جدتِ فکر کا راستہ نکالا ہے۔ دوسرے شعراء کے اس اثر کے باوجود ان کی شاعری کی داخلی دنیا ان کی اپنی ہے۔" ڈاکٹر وحید قریشی اپنی بات کا اختتام اس طرح کرتے ہیں :-

"انہیں تو بے رنگی سے رنگ نکالنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے ۔ ؎

میری بے رنگی پہ نہ جا بے رنگی کے رنگ ہیں سات

ان سات رنگوں سے نصیر الدین شیخ شعر کی دنیا سجاتے ہیں۔

ممتاز دانشور، شاعر اور افسانہ نگار اعجاز حسین بٹالوی لکھتے ہیں :

"نصیر الدین شیخ شاعری بھی کرتے ہیں اور مصوری بھی۔ مصوری میں ان کا موقلم نہایت آسانی سے لینڈ سکیپ پینٹنگ سے تجریدی فن کی طرف سفر کر جاتا ہے اور ان کا حسن ذوق رنگوں کے انتخاب میں ان کی رہبری کرتا ہے۔

شاعری میں وہ یکساں آسانی کے ساتھ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ یہاں جذبے کی صداقت ان کی راہنمائی کرتی ہے اور لفظوں کو محسوس کرنے کی ادبی تربیت ان کی دستگیری کرتی ہے۔ وہ "چند لمحے" کی مختاری جیسے فلسفیانہ خیال سے لے کر نومولود نواسے کی "نئی محبت" جیسے کومل جذبوں تک کو شعر کی گرفت میں لے آتے ہیں۔ مصوری اور شاعری دونوں میں ان کا کینوس زندگی کی رونق اور شادابی سے لہلہاتا نظر آتا ہے۔"

❁ ❁ ❁

نصیرالدین شیخ

○

جینے کی رمق بھی باقی ہے مرنے کا اشارا اپنی جگہ
موجوں کا طلاطم اپنی جگہ دریا کا کنارا اپنی جگہ

تُم دل کو چھپائے بیٹھے ہو ہم جان بھی اپنی ہار گئے
یہ دل ہے کہ پھر بھی کہتا ہے احسان تمہارا اپنی جگہ

اس عالم کی موسیقی میں ہر ذرّہ رقصاں رہتا ہے
زہرہ عطارد اپنی جگہ دُمدار ستارا اپنی جگہ

ہر منزل گزرا لمحہ ہے، ہر ساعت اگلی منزل ہے
انسان کی کاوش اپنی جگہ اور وقت کا دھارا اپنی جگہ

قدرت کی حقیقت کا دل پر اِک عکسِ رواں ہی باقی ہے
منطق کی مسافت اپنی جگہ، وجدان ہمارا اپنی جگہ

یہ اپنی ساری ہستی سے پیمانہ اِک تو بھر نہ سکا
نادم اور شرمندہ ہے دل بے چارا اپنی جگہ

یہ ہستی ہے کہ کرچی کرچی کرکے بکھری جاتی ہے
اور حضرتِ دل کہ مستی میں ہے سارے کا سارا اپنی جگہ

○

اشک سے جو عیاں نہیں ہوتی
لفظ سے بھی بیاں نہیں ہوتی

میری آواز کون سُن پاتا
آنسوؤں کی زباں نہیں ہوتی

ایک پَل میں جو بیت جاتی ہے
عمر بھر میں بیاں نہیں ہوتی

ماورائے زماں ہو جو ہستی
وہ اسیرِ مکاں نہیں ہوتی

جو ندی کوہ میں رواں دیکھی
ریت میں وہ رواں نہیں ہوتی

نصیر الدین شیخ

○

اتنے چُپ کیوں رہتے ہو
آخر کیا کچھ سہتے ہو

آگ اُگلتے موسم کو !
برکھا رُت کیوں کہتے ہو

سجری روشن دنیا میں
اندھیاروں میں رہتے ہو

سچی باتیں کرتے ہو
اُلٹی رَو میں بہتے ہو

سود و زیاں سے بیزاری
کس دنیا میں رہتے ہو

لفظ جہاں پر ساتھ نہ دیں
جانے کیا کیا کہتے ہو

○

زندگی آئینہ سی لگتی ہے!
اس میں معکوس کس کی ہستی ہے

کوئی رستہ نہ سنگِ میل کوئی
تیری بستی بھی کیسی بستی ہے

رات کی تیرگی میں بھی اکثر
روشنی ساتھ ساتھ چلتی ہے

ہر طرف وسعتیں ہیں پابہ رکاب
ان میں آواز کس کی آتی ہے

صبحِ آمد سے شامِ رخصت تک
زندگی ایک خواب لگتی ہے

میرے رُخ پہ یہ کس کے گیسو ہیں
آگ بھی ہے ہوا بھی چلتی ہے

کیسا یہ شہر ہے نصیر یہاں !
جینا مہنگا ہے جان سستی ہے

تشکر کے ساتھ

اعجاز گروپ آف کمپنیز

۳۴- ای ون- گلبرگ III لاہور

فون : ۵۷۱۲۹۱۴ - ۵۷۱۲۹۴۱ - ۵۷۱۲۴۴۷ - ۵۷۶۱۵۵۱ - ۵۷۶۱۵۵۲

فیکس : ۵۷۱۲۵۶۳ —— ٹیلیکس : ۴۷۷۱۲ - اعجاز پی کے۔

ترکش

(ایک جائزہ)

★ ——— **وارث علوی** (بھارت)

جاوید اختر کو پہلی بار میں نے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ صفیہ اختر کے ساتھ دیکھا تھا جب ان کی عمر قریباً چار پانچ سال کی ہوگی اور صفیہ اختر انہیں جادو کہہ کر پکارتی تھیں۔ پھر تو ان کے بارے میں سنتے رہے کہ ان کے نام کا فلم میں بہت دھوم دھڑاکا ہے اور وہ تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ ان کی چند غزلیں بھی شب خون میں نظر آئیں، لیکن ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ۱۹۹۳ء میں انہیں بمبئی کے ایک مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہوئے دیکھا۔ نظمیں فسادات پر تھیں اور دل کو چھوتی تھیں۔ اُن کے پڑھنے کا انداز بہت ہی منفرد تھا۔ تحت میں اچھا پڑھنے والے بہت سے شاعر تھے لیکن جو چیز جاوید اختر کو امتیاز بخشتی تھی وہ قرأت میں خطابت، ڈرامائیت، تھیٹریکلزم، رقت، جذباتیت اور ہر نوع کے تصنع سے احتراز تھا۔ ان کے یہاں نہ تو وہ گھن گرج تھی جو بے جان شعروں میں جان ڈالنے کا سہل حربہ ہے، نہ وہ لجلجاپن اور رقت جو سامعین کے جذبات کو چھونے کی اور اپنے ہی اشعار کے کیف و سرشاری میں ڈوب جانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب ان کا مجموعۂ کلام "ترکش" ہاتھ میں آیا تو پتہ چلا کہ شعر کو سنانے کا ان کا انداز وہی تھا جو شعر کی لفظیات، اسلوب اور لب و لہجہ کا اپنا زائیدہ تھا۔ وہ جتنے صاف شفاف طریقہ سے شعر پڑھتے تھے ان کی شاعری بھی اتنی ہی صاف شفاف اور تصنع سے پاک تھی۔ جاوید اختر کا شعر ہے۔ ؎

کون سا شعر سناؤں میں تمہیں سوچتا ہوں　　نیا مبہم ہے بہت اور پرانا مشکل

اس بیان کی صداقت میں کلام ہو سکتا ہے لیکن اس سے جاوید اختر کے شعری رویہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کا کلام ابہام اور اشکال سے صریحاً پاک ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وقت جیسے مشکل موضوع پر بھی ان کی نظم ایک عامی کی بھی سمجھ میں آجاتی ہے چاہے نظم کا ادراک معنی میں وقت کا فلسفہ سمجھانے میں فلسفی نقاد کا پتہ بھی پانی کیوں نہ ہو جائے۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ تنقید کا پورا زور شاعری میں ابہام، پیچیدگی اور تہہ داری پر ہو اور نقاد کے ناخنِ گرہ کشا کو عقدۂ مشکل پسند آتا ہو۔ صاف اور شفاف شعر کہنا گویا خود کو سطحیت، اکہرے پن، وضاحت اور نثریت کے تیروں کا ہدف بناتا ہے۔

اب جہاں تک نثریت کا تعلق ہے تو اوروں کا کیا ذکر راشد اور اختر الایمان پر بھی یہ اعتراضات وارد ہوتے رہے ہیں۔ عمیق حنفی جو جدید شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ بلند آہنگی اور خطابت کے باوجود جا بجا نثریت اور سپاٹ پن

سے بچ نہیں سکے۔ باقر مہدی، قاضی سلیم، محمد علوی، شہریار، بلراج کومل سب نثریت کے شکار ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقعہ نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ جدید شاعری کو کلاسیکی شاعری کی نغمگی کی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو ایک منظم عروضی نظام، ڈکشن کے آہنگ اور شعر کی موسیقیت، بلند آہنگی اور خطابت کی روایت کا زائیدہ تھا۔ جدید شاعری کا رویہ بڑی حد تک دانشورانہ اور اسی سبب سے مخالف غنائی تھا۔ معرّا نظم، آزاد نظم، نثری نظم نے ویسے بھی شاعری کے حصار میں ایسے روزن و شگاف بنائے تھے کہ نثریت کے لئے راہ کشادہ ہو گئی تھی۔ غزل کے جدید ہزلیہ رنگ، نظم کے اسلوب میں کھردرے پن اور شاعری اور نثر کے درمیان گرتی ہوئی دیواروں کے سبب اگر شاعری کا لہجہ شکستہ، اسلوب سپاٹ اور آہنگ غیر غنائی بنا تو یہ کوئی بہت تعجب کی بات نہیں تھی۔ نثریت کا تریاق جاوید اختر نے اسلوب کی شدت میں پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے اجمال کے حس کے بغیر شدت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے ڈکشن میں صلابت اور کراکرا پن ہے، اسلوب اور لب و لہجہ میں گراوٹ اور لجلجا پن پیدا نہیں ہو پاتا۔

ہماری نظمیہ شاعری کی ایک کمزوری یہ رہی ہے کہ نظمیں مشکل سے ایک مکمل اکائی بن پاتی ہیں۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ نظم ایک خیال، ایک تھیم، ایک مرکزی جذبہ کے گرد تعمیر کی گئی ہو۔ نظم کے سٹرکچر میں ڈیزائن کی وہ کاریگری نہیں ہوتی جو نظم کو ایک وحدانی روپ عطا کرے اور اس کے تاثر میں شدت اور ارتکاز پیدا کرے۔ مختلف اجزاء اچھے ہوتے ہیں لیکن نظم صحرائی سوتے کی مانند ریت میں جذب ہو جاتی ہے۔ نظم کو نظم بنانے کی کوشش راشد، فیض، اختر الایمان، مختار صدیقی، مجید امجد، منیر نیازی، عمیق حنفی، محمد علوی، شہریار، ندا فاضلی کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان شعراء میں جاوید اختر، اختر الایمان سے گہری مشابہت رکھتے ہیں اور جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے "ترکش" کے دیباچہ میں لکھا ہے محمد علوی اور ندا فاضلی کے پہلو میں جگہ بناتے ہیں۔

جاوید اختر کی شاعری، فیض کی غنائیت اور سردار جعفری کی خطابت سے اپنا فاصلہ قائم کرتی ہے اور اسی حقیقت پسندی کو اپناتی ہے جو اختر الایمان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ اس حقیقت پسندی کے سبب ان کے لب و لہجہ میں گفتگو اور ڈرامائیت کا انداز پیدا ہوا ہے۔ حقیقت پسندی کے سبب اکہرے پن کے جو خدشات تھے انہیں طنز اور IRONY کے استعمال نے باطل کیا ہے۔ اسی حقیقت پسندی کے بطن سے ان کے یہاں استعارہ، تمثیل اور علامت جنم لیتی ہے۔ زیادہ تر وہ اپنا کام استعاروں سے نکالتے ہیں، یا ایسی تمثیلوں سے جو نظم کے کنواس پر حقیقت پسند تصویر کی صورت ابھرتی ہیں اور آہستہ آہستہ علامات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

یہ حقیقت پسندی، یہ صاف ستھرا اور شفاف اندازِ بیان، یہ اشکال، ابہام اور گنجلک سے پاک شعری اظہار، ان کی نظموں کو ہمارے لئے فوری توجہ اور دلچسپی کا باعث بناتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر خراب شاعری وہ ہوتی ہے جو رومانیت، غنائیت اور علامت سازی کا طلسم پیدا کر کے روٹی کے گالوں کی مانند موہوم اسلوب اور دھندلی امیجری سے سخن طرازی کا بھرم پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس حقیقت پسند شاعری کوئی ٹھوس خیال، واقعہ، تجربہ یا منظر کا بیان کرتی ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حقیقت پسند شاعری کے اپنے خدشات ہیں جو اکہرے پن، عامیانہ پن اور پیش پا افتادگی کی شکل میں سامنے

آتے ہیں۔ دھند میں لپٹی ہوئی رومانی شاعری تو اپنا شاعرانہ طلسم قائم رکھتی ہے۔ لیکن حقیقت پسند شاعری چونکہ روایتی بندشوں اور رومانی کلی شینز سے مبرّا ہوتی ہے، اس لئے اگر ٹھوس، پہلودار اور معنی خیز نہ ہو تو پہلی ہی خواندگی میں اپنی وقعت کھو دیتی ہے۔ وہ اپنی فطرت ہی میں دانشورانہ اور مفکرانہ ہوتی ہے۔ اگر فکر اور فن میں ہم آہنگی اور رچاؤ نہ ہو تو نظم کا خیال نظم سے الگ ہو کر قاری کے ذہن میں ایسے سوالات پیدا کرتا ہے اور ایسے مباحث کی ہڑبونگ کو جنم دیتا ہے جو نظم کی جمالیاتی سالمیت اور تاثر کو گزند پہنچاتے ہیں۔

مثلاً جاوید اختر کی نظم "الجھن" جو بڑھتی ہوئی آبادی میں اس کش مکش کا بیان ہے کہ اگر رُک گیا تو پیچھے سے آتی ہوئی بھیڑ کچل دے گی اور اگر چلتا ہوں تو خود میرے پیروں میں کسی کا چہرہ، کسی کا سینہ، کسی کا بازو کچلا جاتا ہے۔

چلوں تو اوروں پہ ظلم ڈھاؤں رُکوں تو اوروں کے ظلم جھیلوں

شاعر اپنے ضمیر سے جسے اپنی منصبی پر بڑا ناز ہے پوچھتا ہے کہ تیرا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں شاعر کا ڈائیلما پوری انسانیت کا ڈائیلما ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں۔ نظم کی اُلجھن نظم میں قید نہیں رہتی۔ قاری کو وہیں لے جاتی ہے جہاں سے آئی ہے، یعنی بایولوجی، معاشیات اور اخلاقیات کے شعبوں میں۔ نظم کی جو دنیا ہے اس میں آدمی تو چلے گا، اور جو طاقتور ہے وہ کمزور کو کچلے گا کیونکہ یہی جہد البقا کا تقاضا ہے اور ڈارونزم اخلاقیات کو قطعی شمار میں نہیں لیتا جو مسئلہ بایولوجیکل ہے اس کا اخلاقی حل کیسے مل سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو کسی اور ہی سطح پر حل ہونا چاہیئے۔ نظم میں تو مسئلہ مسئلہ ہی رہے گا، اور نظم کو نظم بننے نہیں دے گا۔

"دو راہا" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ڈائیلما کی نظم ہے اور یہ نظم جاوید اختر نے اپنی بیٹی زویا کے نام لکھی ہے۔ دو راستے ہیں۔ ایک راستہ میں فرد خود کو ریتوں رسموں رشتوں میں کھو دیتا ہے، کچھ نہیں پاتا۔ اوپر اوپر جیتا ہے، اندر اندر مر جاتا ہے۔ دوسرا راستہ کٹھن ہے۔ اس میں فرد کو آبائی اور موروثی سہارے حاصل نہیں ہوتے۔ وہ اپنی جدوجہد میں تنہا ہوتا ہے، لیکن وہ رستہ میں خود کو پاتا ہے۔ شاعر بیٹی کو یہی راہ اپنانے کی تلقین کرتا ہے لیکن — لیکن مجھ کو یہ غم بھی ہے / تم کو اب تک کیوں اپنی پہچان نہیں ہے۔

نظم سطح پر اچھی ہے کیونکہ ایسی تلقینات والدین کا شیوہ ہے لیکن تلقین ہمیشہ اس زمانہ کے مشاہدے پر ہوتی ہے جس میں آدمی جیتا ہے لیکن دنیا بدلتی رہتی ہے اور ساتھ ہی وہ آدمی بھی جو اس کا مشاہدہ کر رہا ہے، لہٰذا تلقین چاہے اتنی درست ہو پائیدار نہیں رہتی۔ پھر اس تلقین میں اس دنیا کا عکس ہے جو مٹتی جا رہی ہے جو ریتوں، رسموں اور رشتوں کی دنیا تھی، جس کے سبب زندگی آسان تھی، راستے مانوس تھے اور آدمی دنیا میں اجنبی نہیں تھا۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور مادہ پرستی کی بنائی ہوئی وہ نئی دنیا جس نے فرد کو کمیونٹی لائف سے محروم کر کے اسے بڑے شہروں کی ایک پرچھائیں بنا دیا، اس سے اس کی شناخت چھین لی کیونکہ شناخت اسی وقت قائم ہوتی ہے جب آدمی دوسروں سے رشتہ قائم کرتا ہے۔ اسے اجنبی، تنہا اور اپنی زمین سے اکھڑا ہوا بنا دیا، اس سے زندگی کے مانوس طریقے چھین کر پوری زندگی کے تجربات کا بکھیڑا

بنا دیا — یہ نئی دنیا آج کے آدمی کے لئے اتنا بڑا چیلنج بن کر آئی ہے کہ صارفیت، چوہوں کی دوڑ، گلا کاٹ مقابلے نے کمزور اور طاقتور کے بیچ جہد البقا کی ایسی سفاک مثال قائم کی ہے کہ آج کے فرد کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے اسلوبِ حیات کا تعین بن گیا ہے جو اس کی دسترس میں بھی نہیں رہا۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ فطرتِ انسانی کو چند ضرورتوں کی ترتیب کہا جا رہا ہے، ذات کا کوئی تصور نہیں کیونکہ وہ تمام سرچشمے جن سے ذات تشکیل پاتی تھی اور اسی سبب سے جدید آدمی کو اندر سے کھوکھلا کہا جا رہا ہے۔ ایک لڑکی کے سامنے ذات کی پہچان کی بات اگر مضحکہ خیز نہیں تو المناک ہے، جہاں تک دشوار راہ کا تعلق ہے تو زندگی آدمی کے لئے کبھی آسان نہیں رہی۔ بے شک روایتی طرزِ حیات کو زنگ لگ جاتا ہے، اس میں انحطاط اور سڑانڈ پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے طرزِ حیات، کے خلاف بغاوتوں کی تاریخ سے ہم واقف ہیں لیکن آج کا سب سے بڑا مسئلہ تو غیر انسانی معاشرے کو انسانی بنانے کا ہے تاکہ پرچھائیں پھر سے گوشت پوست کا آدمی بنے اور بھری پری زندگی کا امکان پیدا ہو، میرا خیال ہے اس نظم میں جو باپ کا غم ہے اسے ہیرا بننا ہے جو شاعر کا غم ہوتا ہے۔ اسی غم میں ایک نئی نظم کا امکان رہا ہے، ایک ایسی نظم جو ڈبلیو بی ایٹس نے "اپنی بیٹی کے لئے دعا" کے عنوان سے لکھی ہے۔ جاوید اختر کو اور دوسرے شاعروں کو بھی یہ نظم لکھنی ہے کیونکہ بیٹیوں کے لئے دعا کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

"مدر ٹریسا" میں شاعر کا ڈائیلما اور پیچیدہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ اوّل تو شاعر یہاں وہ مہرہ ہے جو مقابلہ کی دنیا میں کامیابی کی منزل سر کر چکا ہے لیکن اس میں وہ انقلابی مراسنیں جو بقول صفیہ اختر کے پانچ سال کی عمر میں اس میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس انقلابی کی آنکھ سے مدر ٹریسا کو دیکھتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے ایک دوسرے انقلابی طارق علی نے دیکھا تھا۔ ویسے بھی انقلابی، سماجی خدمت کو اوپر کی لیپا پوتی سمجھتا ہے کیونکہ وہ تو اس نظام ہی کو بدلنا چاہتا ہے جو نرادھار کچلے ہوئے لوگوں کو جنم دیتا ہے، چنانچہ جاوید اختر مدر ٹریسا سے کہتے ہیں، وہی نظامِ زر جس نے ان بھوکوں سے روٹی چھینی/ ترے کہنے پر/ بھوکوں کے آگے کچھ ٹکڑے ڈال رہا ہے .... ایک جانب مظلوم سے تجھ کو ہمدردی ہے/ دوسری جانب ظالم سے بھی عار نہیں ہے — لیکن پھر جاوید اختر کو احساس ہوتا ہے کہ وہ خود ایک بورژوا سٹ اَپ کا فرد ہے اور اسے ایسی باتیں کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں ٹھہرا خود غرض/ بس ایک اپنی ہی خاطر جینے والا۔ اور پھر وہ مدر ٹریسا کی عظمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔

میرا خیال ہے جاوید اختر کا ضمیر اور ان کے اندر کا انقلابی غلط موقعوں پر جاگتا ہے۔ اس فرشتہ خصلت بڑھیا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ان بوڑھوں، بیماروں اور اپاہجوں پر ان کی موت آسان کی جو شہروں کی سڑکوں پر کتوں کی اذیت ناک موت مرتے تھے۔ اس کام کا آغاز اس نے ایسی تاریک کھولیوں سے کیا جو قبر کی یاد دلاتی تھیں لیکن وہاں دم توڑنے کے لئے ایک مہربان ماں کی آغوش تھی، اور زخموں کا مرہم تھا۔ دھن تو بعد میں آیا اور دھن تو دھن پتیوں کے پاس سے ہی آتا ہے۔ مدر ٹریسا کا سروکار نظامِ زر نہیں تھا بلکہ ایسے لوگ تھے جنہیں ان کے خدا نے بھی تیاگ دیا تھا۔ سماجی خدمت ایک سعادت ہے جو چند ہی برگزیدہ بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کا آرکی ٹائپ یسوع مسیح ہے اور ٹائپ اپنی

کم ترین شکل میں راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ "من کی من میں رہی" کا وہ مادھو ہے جس سے دوسروں کے دُکھ دیکھے نہیں جاتے ورنہ عام انسانیت کا رویہ تو انسانی دُکھ سے آنکھیں چُرانے کا رہا ہے۔ ایک ایسے دَور میں جبکہ نظامِ زر کا مارکسی تجزیہ خود اشتراکی ملکوں میں خاک میں مل گیا، مدر ٹریسا سے یہ توقع کرنا کہ وہ نظامِ زر کا صحیح شعور رکھیں، عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ نظامِ زر کی کیا بات۔ جس طرح نظامِ دہر چل رہا ہے، اس نے تو لوگوں کو مابعد الطبیعیاتی بغاوت کی طرف بھی اُکسایا ہے۔ خدمت گزار صرف دُکھ کو دیکھتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا کہ دُکھ کہاں سے آیا ہے۔ فنکار کے لئے بھی یہ بہت ضروری ہے کہ وہ جس شے کو دیکھ رہا ہے اس شے کی حقیقت کو پہچانے۔ نظم میں چونکہ مدر ٹریسا سے نظامِ زر سے اپنی ذات سے ٹکرا رہا ہے اس لئے جدلیاتی کھینچ تان اور ردّ و قبول اسے ایک تناؤ عطا کرتے ہیں اور اس میں ہماری دلچسپی برقرار رہتی ہے لیکن وہ فن کا ایسا نمونہ نہیں بن پاتی جو دل پر گہرا نقش چھوڑے۔

"ایک مہرے کا سفر" میں ڈائیلما چونکہ آپ بیتی کا رنگ اختیار کر گیا ہے اس لئے نظم ایک شخصی تجربہ میں ڈھل گئی ہے بساطِ ہستی پر آدمی ایک مہرہ ہے اور دوسرے مہرے اسے بے رحمی اور چالاکی سے کچلنے کے درپے ہیں لہٰذا کم عمری ہی میں اس نے جان لیا تھا کہ اگر اسے جینا ہے تو بڑی چالاکی سے جینا ہوگا۔ گو کہ معمولی مہرہ تھا مگر جیت گیا۔ اب وہ محفوظ ہے اِک خانہ میں / اتنا محفوظ کہ دشمن تو الگ / دوست بھی پاس نہیں آ سکتے / اس کے اِک ہاتھ میں ہے جیت اس کی / دوسرے ہاتھ میں تنہائی ہے۔

ظاہر ہے جب بساطِ ہستی بساطِ شطرنج ہو، ہر چال میں چالاکی اور سفاکی ہو، معاملہ شہ اور مات، ہار اور جیت کا ہو تو وہاں محبت، رفاقت، ایثار نفسی کی جگہ رقابت، خود غرضی اور بے رحمی کے جذبات لے لیتے ہیں۔ ڈارونزم، سرمایہ دارانہ مقابلہ اور چوہوں کی دوڑ میں شامل آدمی کا یہ فطری انجام ہے کہ کامیابی کے شکھر پر دوست تو کیا وہ لوگ بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتے جن سے اس کا خونی رشتہ ہے۔ تنہائی اس کا مقدر ہے۔ وہ ایسا نقش عبرت ہے جو نہ تو تلافیٔ مافات کر سکتا ہے نہ ہم سے ہمدردی وصول کر سکتا ہے، کیونکہ ہمدردی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کامیابی کا خواب ٹوٹ جائے، جیسا کہ آرتھر ملر کے ڈراموں میں امریکی خواب کی شکست کے بعد اس کے کرداروں میں ایک المیہ ڈائمنشن پیدا ہوتا ہے۔ ایک نظر سے دیکھیں تو پورا بیسویں صدی کا ادب بورژوا اقدار کے خلاف احتجاج کا ادب ہے۔ احتجاج کی منزل ڈائیلما کے بعد کی ہے جبکہ آدمی تیسرا ہی راستہ پسند کرتا ہے جو روم نہیں جاتا، کہیں بھی نہیں جاتا، کیونکہ منزل کا کوئی تعین نہیں۔ ایک معنی میں بے سمت ہے۔ اخترالایمان کی پگڈنڈی کی مانند جو دُور افق میں غائب ہو جاتی ہے، والٹ وہٹ مین کے بڑے راستوں کی مانند جو میدانوں، وادیوں اور پربتوں کا احاطہ کرتے ہیں اور وہٹ مین کے فورڈ ایڈیشن بیٹ نسل کے ہائی ویز کی مانند جس پر ان کی بے مقصد کاریں دوڑا کرتی ہیں۔ ڈارونزم سے نجات کے لئے آدمی نے ہمیشہ ایک نئی رومانیت کی تلاش کی ہے جس کے بغیر زندگی اور شاعری میں لطیف جذبات پنپ نہیں سکتے۔ یہ رومانیت اچھی شاعری کی ضامن ہے جیسا کہ خود جاوید اختر کی نظم "وہ کمرہ یاد آتا ہے" سے ظاہر ہے۔ اس نظم میں بھی بچپن کے کمرے اور حال کے خوب صورت گھر کا تضاد ہے لیکن تضاد ڈائیلما میں

نہیں بدلتا کیونکہ نظم کا سرچشمہ نوسٹالجیا کا رومانی جذبہ ہے جو یادوں کے پھول کھلاتا ہے۔ پوری نظم کی تعمیر ایسی امیجری سے ہوئی ہے جو کمرے کو بولتا ہوا بتاتی ہے۔ کبھی تو کمرہ مہربان ماں کی صورت بچہ کو آنچل میں چھپا لیتا ہے اور پیار سے ڈانٹتا ہے کہ جلتی دوپہر میں کہاں مارے مارے گھومتے رہے۔ نشیم کا دروازہ ہے، دبیز اور خاصا بھاری، کچھ ذرا مشکل سے کھلنے والا جیسے کوئی اکھڑ باپ اپنے کھُردرے سینے میں شفقت کے سمندر کو چھپائے ہو۔ آئینہ گستاخ اور منہ پھٹ ہے۔ کتابیں شیلف اور طاق میں سنجیدہ استانی بنی بیٹھی ہیں۔ نظم میں شاعر کی نظر بچہ کی نظر ہے جو بے جان چیزوں میں جان ڈالتی ہے۔ ہر چیز کو انسانی روپ، لمس اور آواز عطا کرتی ہے۔ یہی بچہ بڑا ہو کر خوب صورت گھر بناتا ہے اور اسے قیمتی چیزوں سے سجاتا ہے لیکن گھر بات نہیں کرتا۔ وہ کرشمہ جو چیزوں میں جان ڈالتا ہے، بچپن کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے یہ کرشمہ پھر سے شاعر میں زندہ ہوتا ہے اور وہ لمحہ ہے اس نظم کی تخلیق کا۔ شاعر میں بچہ زندہ نہ ہو کر یہ کرشمہ اسے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اسی لئے شاعر میں بچہ جب جب جاگتا ہے تخیل اپنے رنگ بکھیرتا ہے اور ایسی شاعری جنم لیتی ہے جو دانشورانہ چیرہ دستیوں سے پاک ہو۔

"ترکش" میں رومانی محبت کی بعض بہت ہی دلچسپ نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں رومانی کیف و مستی نہیں بلکہ جذباتی رشتوں کو ایک حقیقت پسند ذہن کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش ہے، اسی لئے ان میں نفسیاتی اور دانشورانہ چوکسائی ہے لیکن چونکہ معاملہ من و تو کا ہے اس لئے لب و لہجہ میں نرم آہنگی اور کوملتا ہے اور تخیل اپنے رنگ بکھیرتا ہے۔ اس سلسلہ میں "بنجارہ"، "معمہ"، "ہجر"، "دشواری"، "آثار قدیمہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"دشواری" میں شاعر کسی لڑکی سے خاموش یک طرفہ محبت کا گنہ گار ہے۔ اسے کبھی جرأت نہ ہوئی کہ اپنی محبت کا اظہار کرے۔ دل کی بات زبان تک آئی ہی نہیں۔ اب انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ سلسلہ ختم کیا جائے۔ محبوب کو بھلا دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کون سی چیز کو وہ بھلائے — وہ ایک سلسلہ جو دونوں کے بیچ تھا ہی نہیں، وہ اِک خیال جو لفظوں میں ادا نہیں ہوا۔ وہ اک بات جو زبان تک آئی ہی نہیں۔ وہ ایک ربط جو آپس میں رہا ہی نہیں۔ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ جو ہوا ہی نہیں وہ بھی شاعر بھول نہیں سکتا تو پھر محبوب کو کیسے بھولے جو ایک حقیقت ہے کوئی خواب نہیں۔ اس کی یک طرفہ محبت اسے ایک خواب ہی معلوم ہوتی ہے اور وہ خواب کو بھلا نہیں سکتا تو حقیقت کو کیسے بھلائے۔ نظم دیکھئے :۔

میں بھول جاؤں تمہیں / اب یہی مناسب ہے / مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں / کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو / کوئی خواب نہیں / یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں / کمبخت / بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ / جو تھا ہی نہیں / وہ اِک خیال / جو آواز تک گیا ہی نہیں / وہ ایک بات / جو میں کہہ نہیں سکا تم سے / وہ ایک ربط / جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں / مجھے ہے یاد وہ سب / جو کبھی ہوا ہی نہیں۔

"معمہ" میں دو محبت کرنے والے دل باہم مل کر زندگی کو معنی دیتے ہیں۔ پھر دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسا ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک ہوں اور معنی پائیں۔ لیکن سوچنا یہ پڑے گا کہ وہ لمحے جو علیحدگی

کے دنوں میں معنی سے خالی رہ گئے۔ ان میں کیا بھرنا ہوگا۔ نظم کا رمز یہ ہے کہ معنویت کا پورا عمل غیر شعوری ہے۔ محبت میں زندگی معنی خیز لگتی ہے لیکن معنی کیا ہیں کوئی نہیں جانتا۔

معنی خیزی کا یہ غیر شعوری عمل کس نوعیت کا ہوتا ہے اس کی دلچسپ مثال جاوید اختر کی نظم "ہجر" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ نظم سہل ممتنع ہے۔ اوپر سے سیدھی سادی لیکن نفسیاتی گہرائیاں لئے ہوئے۔ جدائی میں آدمی اپنے مشاغل میں مصروف رہتا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں محبوب کو شریک کرنے کے خیال سے غافل نہیں رہتا۔ مثلاً کوئی شعر کہوں، دنیا کے کسی موضوع پر کوئی نیا مضمون پڑھوں، کوئی انوکھی بات سنوں، کوئی فقرہ جو دلچسپ لگے، کوئی خیال جو اچھوتا ہو، کوئی منظر جو حیران کر دے۔ میں اپنے ذہن کے گوشوں میں / ان سب کو سنبھال کے رکھتا ہوں / اور سوچتا ہوں / جب ملو گے / تم کو سناؤں گا۔

"بنجارہ" خوب صورت نظم ہے۔ بنجارے اور شعری عنایت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے کیونکہ بنجارے کا چل چلاؤ اور دربدری اپنا آہنگ آپ کرتی ہے۔ نظم کا علامتی نظام پیچیدہ ہونے کے باوصف واضح اور صاف ہے۔ پیچیدہ اس معنی میں کہ حرماں نصیب عاشق وہ بنجارہ ہے جو مکان میں نہیں زمان میں سفر کر رہا ہے لیکن زمان کا بیان مکان کے استعاروں میں ہی ہوا ہے۔ مثلاً بنجارہ جب رختِ سفر باندھتا ہے تو اس شہر کے سارے باسی یعنی وہ سارے دن اور سارے لمحے جن میں محبوب کی زلف کی خوشبو، اس کا لمس بسا ہوا ہے اسے رخصت کرنے آتے ہیں۔ نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ وقت گزرتا جاتا ہے۔ بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتا رہتا ہے، اور ہر دوسرے شہر، وقت کے ہر منطقے کے لئے محبوب کی یاد دھندلی ہوتی جاتی ہے لیکن یہ کسک آخر تک باقی رہتی ہے کہ اس سفر میں تم ساتھ ہوتیں تو ایسا ہوتا، تم ہوتیں تو ویسا ہوتا۔

"آثارِ قدیمہ" بنجارے سے بھی زیادہ خوب صورت اور معنی خیز نظم ہے۔ اس کی تکنیک تمثیلی ہے۔ شاعر پہلے مثال قائم کرتا ہے۔ آج جہاں صحرا ہے وہاں کبھی شہر ہوا کرتا تھا۔ اس کی نشانی وہ آثارِ قدیمہ ہیں جو کھدائی کے دوران ہاتھ لگے ہیں۔ پتھر کی صورت۔ تانبے کے پرانے سکے۔ کالی چاندی کے زیور۔ کانسی کے ٹوٹے برتن۔ اب اس مثال کو وہ اپنی موجودہ صورتِ حال پر منطبق کرتا ہے۔ محبوب اس کا ہو نہ سکا لیکن کہیں اس سے اتفاقیہ ملاقات — لیکن یہ خیال اتنا نازک ہے کہ نظم کی ساخت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا حسن اس اجمال میں ہے جو جاوید اختر کی نظموں کا امتیازی وصف ہے۔ نظم کا باقی حصہ سنیئے۔

اور مجھ کو یہ خیال آتا ہے / کسی تقریب / کسی محفل میں / سامنا تجھ سے مرا آج بھی ہو جاتا ہے /
ایک لمحے کو / بس اِک پل کے لئے / جسم کی آنچ / اچٹتی سی نظر / سُرخ بندیا کی دمک / سرسراہٹ
ترے ملبوس کی / بالوں کی مہک / بے خیالی میں کبھی / لمس کا ننھا سا پھول / اور پھر دور تک
وہی صحرا / وہی صحرا کہ جہاں / کبھی اِک شہر ہوا کرتا تھا۔

'ترکش' کی دوسری نظموں پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں لیکن جو نظمیں مجھے پسند ہیں وہ ہیں "جہنمی"، "صبح کی گوری"، "بے گھر ہل اسٹیشن"، "فساد سے پہلے، فساد کے بعد"، "مری دعا"۔ ان ہی سے صرف چند کا مختصر ذکر کروں گا۔

"صبح کی گوری" گو نظم ہے لیکن گیت کا آہنگ اور کو ملتا لئے ہوتے ہے۔ سورج اندھیرے میں کھو گیا اور صبح کی گوری جاگ نہیں رہی۔ کہیں سورج کو لانا ہے تاکہ گوری جاگے۔

"بے گھر" میں ایک سادہ سا مسئلہ ہے۔ انسان کے تمدن کی تاریخ کتنی شاندار ہے لیکن شام ہوتی ہے تو پرندے اپنے گھونسلوں میں پہنچتے ہیں۔

ہم ہی حیران ہیں / اس مکانوں کے جنگل میں / اپنا کہیں ٹھکانا نہیں / شام ہونے کو ہے / ہم کہاں جائیں گے۔

شاعر کے غم کے ہیرا بننے کا ذکر میں نے "دوراہا" نظم کے تعلق سے کیا تھا۔ "جنھی" میں اسی غم کا ذکر ہے۔ ذہن کی گلیوں میں بہتا غم کا یہ لاوا ٹھنڈا بھی ہو سکتا ہے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رشتوں میں پڑی دراڑوں سے برفانی ہوائیں اندر آکر جسم و روح دونوں کو منجمد کر دیں۔ لہٰذا - غم کا یہ لاوا اذیت ہے / مگر پھر بھی غنیمت ہے / اسی سے روح میں گرمی / بدن میں یہ حرارت ہے / یہ غم میری ضرورت ہے / میں اپنے غم میں زندہ ہوں۔

"ہل اسٹیشن" خوب صورت پابند نظم ہے اور فطرت کی قضا بندی بہت کی گئی ہے۔ فساد سے پہلے اور فساد کے بعد میں فسادزدہ شہر کی منظر کشی بولتے ہوئے شعری پیکروں سے کی گئی ہے۔ "میری دعا" میں خلا کے باشندے جب ہماری دنیا میں آتے ہیں تو ہم پر یہ راز کھلتا ہے کہ ہم جو ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں بالکل ایک دوسرے کے جیسے ہیں۔ نظم "مانوس حقیقت کو غیر مانوس بنا کر دھچکا پہنچانے کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔

جاوید اختر کی نظم "وقت" ایک بڑی حوصلہ مندانہ کوشش ہے۔ وقت کا فلسفہ مشکل ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں چند ہی لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ میں تو یقیناً ان چند لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ اور میرا خیال ہے جاوید اختر بھی نہیں ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جاوید اختر نے یہ نظم کیا بغیر وقت کا فلسفہ سمجھے لکھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شاعری میں جو کچھ بھی فلسفہ ہوتا ہے وہ ان تصورات کی شکل میں ہوتا ہے جو مقبول ہو جاتے ہیں۔ اس نظم میں بھی ایسے ہی تصورات سے کام لیا گیا ہے جو عام طور پر وقت کے فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں میں مقبول ہیں۔ جاوید اختر نے ان تصورات کو ایسے استعاروں، تمثیلوں اور شعری پیکروں کے ذریعہ پیش کیا ہے کہ ایک عام آدمی بھی نظم سے لطف لے سکتا ہے۔ ایک مشکل موضوع پر جاوید اختر نے اتنی آسان اور عام فہم نظم لکھی ہے کہ مشاعروں میں اسے بے ساختہ داد سے نوازا جاتا ہے۔

"ترکش" میں لفظوں کے پہلو بہ پہلو غزلیں بھی شامل ہیں جن میں وہ رنگ سخن موجود ہے جو غزل کی شاعری کو ہمارے لئے اس قدر دلپذیر بناتا ہے۔

؎ تمہیں بھی یاد نہیں اور میں بھی بھول گیا — وہ لمحہ کتنا حسیں تھا مگر فضول گیا

؎ اس دریچے میں بھی اب کوئی نہیں اور ہم بھی — سر جھکائے ہوئے چپ چاپ گزر جاتے ہیں

؎ تب ہم دونوں وقت چرا کر لائے تھے — اب ملتے ہیں جب بھی فرصت ہوتی ہے

کلاسیکی رنگِ سخن کے ساتھ ساتھ جدید غزل کی مضمون آفرینی کا اثر بھی جاوید اختر کی غزل نے قبول کیا ہے۔ اس طرز کے دو رنگ ہیں۔ ایک میں امیجری زیادہ مادی اور خارجی ہے۔

؎ اونچی عمارتوں سے میرا مکان گھر گیا — کچھ لوگ میرے حصّے کا سورج بھی کھا گئے
؎ گلی میں شور تھا ماتم تھا اور ہوتا کیا — مَیں گھر میں تھا مگر اس غل میں کوئی سوتا کیا

دوسرا رنگ وہ ہے جس کی امیجری زیادہ نازک اور لطیف ہے کیونکہ نازک خیال اور گہرے احساس کی ترجمان ہے۔

؎ تھکن سے چُور پاس آیا تھا اس کے — گرا سوتے میں مجھ پر یہ شجر کیوں
؎ سب ہوائیں لے گیا میرے سمندر کی کوئی — اور مجھ کو ایک کشتی بادبانی دے گیا
؎ ہے پاش پاش مگر پھر بھی مُسکراتا ہے — وہ چہرہ جیسے ہو ٹوٹے ہوئے کھلونے کا
؎ اپنی وجہ بربادی سنیئے تو مزے کی ہے — زندگی سے یوں کھیلے جیسے دوسرے کی ہے
؎ مرے وجود سے یوں بے خبر ہے وہ جیسے — وہ ایک دھوپ گھڑی ہے مَیں رات کا پل ہوں
؎ خودکشی کیا دکھوں کا حل بنتی !! — موت کے اپنے سو جھمیلے ہیں !!
؎ تھیں سجی حسرتیں دکانوں پر — زندگی کے عجیب میلے تھے !!

جاوید اختر کا وہی ڈائیلما جو نظموں میں جرح و نقد کو دعوت دیتا ہے، جب غزل کے اشاروں اور کنایوں میں بیان ہوتا ہے تو تضادات تحلیل ہو کر ایک نئی شعری حقیقت کو جنم دیتے ہیں جو اپنی جگہ مکمل، غیر متنازعہ فیہ اور صداقت کی حامل ہوتی ہے۔ "ترکش" کی پہلی ہی غزل کے یہ اشعار دیکھئے۔ ؎

بچھڑ کے ڈار سے بن بن پھرا وہ — ہرن کو اپنی کستوری سزا تھی
کبھی جو خواب تھا وہ پا لیا ہے — مگر جو کھو گئی وہ چیز کیا تھی
جسے چھُولوں میں وہ ہو جائے سونا — تجھے دیکھا تو جانا بد دعا تھی
مریضِ خواب کو تو اب شفا ہے — مگر دنیا بڑی کڑوی دوا تھی

کچھ اور شعر دیکھئے :

؎ گن گن کے سکّے ہاتھ مرا کھُردرا ہوا — جاتی رہی وہ لمس کی نرمی، بُرا ہوا
؎ تُو تو مت کہہ ہمیں بُرا دنیا — تُو نے ڈھالا ہے اور ڈھلے ہیں ہم
؎ جو پر سمیٹے تو اِک شاخ بھی نہیں پائی — کھُلے تھے پَر تو مرا آسمان تھا سارا
؎ ان چراغوں میں تیل ہی کم تھا — کیوں گلہ پھر ہمیں ہوا سے ہے
؎ آج کی دنیا میں جینے کا قرینہ سیکھو — جو ملیں پیار سے ان لوگوں کو زینہ سمجھو

اور آخر میں اس غزل کے چند شعر سُنیئے جس میں اپنے پُر آشوب عہد کا پورا کرب اور عتاب سما گیا ہے : ؎

کن لفظوں میں اتنی کڑوی کسیلی بات لکھوں — شعر کی میں تہذیب بناؤں یا اپنے حالات لکھوں
غم نہیں لکھوں کیا میں غم کو جشن لکھوں کیا ماتم کو — جو دیکھے ہیں مَیں نے جنازے کیا ان کو بارات لکھوں
قاتل بھی مقتول بھی دونوں نام خدا کا لیتے تھے — کوئی خدا ہے تو وہاں کہاں تھا میری کیا اوقات لکھوں

٭ ٭ ٭

جھروکے

(ایک سرسری مطالعہ)

★ ———— محمّد عالم خان

اُردو کہانی میں طرزِ اظہار کا مسئلہ بہت زیرِ بحث رہا ہے۔ بیانیہ کہانی کی روایت سے لے کر جدید افسانے تک اظہار کے بہت سے تجربات ہوئے، اور ہر تجربے نے اُردو افسانے کے دامن کو وسعت عطا کی لیکن ہر عہد کی کہانی میں ایک بات ہمیشہ سے مرکزی حیثیت کی حامل رہی ہے۔ وہ انسانی زندگی اور اس سے وابستہ خواہشات و احساسات کی عکاسی ہے جسے ہر نوع افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ اُردو کہانی کے اس سفر میں "حسن و محبت" کو بنیادی اہمیت دی جاتی رہی اور سب افسانہ نگاروں نے زندگی میں حسن، رنگینی اور تخیّل کی مدد سے ایسی کہانیاں تخلیق کی ہیں جنہوں نے معاشرے کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ مسرت و شادمانی کو بھی بڑے سلیقے اور فنکاری سے نمایاں کیا ہے۔ قاضی پیروز بخت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہانی کہنے کے لئے شعوری سطح پر کسی مخصوص طرزِ نگارش کو اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا لب و لہجہ بہت سادہ، دلکش اور عام فہم ہے۔ ان کی کہانیوں کا انداز مجلسی زندگی کا ماحول لئے ہوئے ہے یا پھر کوئی ایک خاندان ہے۔ جہاں چاچاجی، رفیع بھائی، گلینڈا، بلہ، بلیوں والے شاہ، خالی اور دیگر افرادِ خانہ ہیں جن کی زندگیاں باری باری کہانیوں کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ افسانہ نگار ایک جھروکے میں کھڑا ان کرداروں کو خود بھی دیکھ رہا ہے اور قارئین کو بھی دکھا رہا ہے۔ اس کی کہانیاں بے ساختہ انداز میں شروع ہوتی ہیں اور کرداروں کی زندگی کی تصویریں متحرک ماضی بن کر آنکھوں کے سامنے تھرکنے لگتی ہیں۔ ابتدا میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہنستی کھیلتی زندگی کسی شدید المیے کی زد میں آجائے گی۔ اور ایک سیدھا سادا "دیہاتی داستان گو" کہانی کو کتنی بڑی، تلخ اور کٹیلی حقیقت سے ہم کنار کردے گا، اور محض ایک "شخصیت نگاری" کا غیر محسوس طور پر دلفریب انداز ایک جاندار افسانوی حُسن میں ڈھل جائے گا۔ اِس امر کا اندازہ تو کہانی کے انجام پر پہنچ کر ہی ہوتا ہے جب قاری کو ایک جھٹکا لگتا ہے اور اس کے تخیّل کی پرواز ارضی حوالوں سے ہوتی ہوئی فکر کی ہمہ جہت بلندیوں کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ اور یہی وہ اندازِ نظر ہے جو قاضی پیروز بخت کو اہم افسانہ نگار کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے آخری حصے یوں لکھتے ہیں:-

"..... اس نے مجھے ایک ڈیکوریشن پیس کا تحفہ دیا تھا۔ کانسی کے دو پرندے،

ایک شاخ پر بیٹھے، ایک دوسرے کی طرف منہ کئے چہچہا رہے تھے۔ میں نے اس تحفہ کو نمایاں مقام پر سجا رکھا ہے، میں جب بھی ان پرندوں کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے میرے دوست اور میری بھابی کی روحیں کانسی میں ڈھل گئی ہیں، اور اپنی شاخ پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں۔" (میرا دوست، صفحہ نمبر ۲۵)

قاضی پیروز بخت آپ بیتی، واقعہ نگاری اور شخصیت نگاری کے توسط سے اپنی کہانی مکمل کرتے ہیں اور بالعموم ان کی کہانیاں ماضی کی یادداشتوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اپنا ماضی بہت عزیز ہے، لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ وہ اپنے موجود سے بھی بے حد مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورتِ حال اور رنج والم کو زندگی کا ضروری جزو خیال کرتے ہوتے۔ اسے ایک تاریخی تسلسل میں پیش کرتے ہیں لیکن کبھی بھی ان کی کہانیوں میں مایوسی اور یاسیت کا غلبہ دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی کہانیوں میں بچھڑی ہوئی رفاقتوں کا کرب بدرجہ اُتم موجود ہے لیکن اس درد کا تاثر بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ وہ ایک جگہ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"..... ریٹی گن والی کوٹھی ویران ہو گئی، جہاں کبھی خوب صورت لان اور تراشیدہ جھاڑیاں تھیں اور برآمدے کے ساتھ دیوار پر بوگن ویلیا کی بیل چڑھی تھی جو سُرخ پھولوں سے لدی تھی .... پتہ نہیں، ان جھاڑیوں اور بوگن ویلیا کے پھولوں کا کیا حال ہو گا۔" ("ھلہ" صفحہ نمبر ۸۱)

پیروز بخت قاضی کی کہانیاں پڑھ کر کہانی نگاری کے بہت سے پہلوؤں کی طرف دھیان جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے تاریخ، شخصیت اور واقعات کو فکشن بنانے کی جس انداز سے کوشش کی ہے وہ ایک مشکل ترین فن ہے انہوں نے سادگیٔ اظہار اور واقعاتی صداقتوں کو ہم آہنگ کر کے ایک منفرد اسلوبِ نگارش کو متعارف کروایا ہے۔ عام طور پر جب تاریخی حقیقتوں کو کہانی کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کسی حد تک حقائق کی کاٹ چھانٹ کرنا پڑتی ہے اور اکثر قطع و برید کے اس عمل میں اصل واقعہ کی صداقت بھی مجروح ہو جاتی ہے۔ یا پھر کہانی کا تاثر بہت مختلف طریقے سے سامنے آتا ہے لیکن "جھروکے" کی کہانیوں میں ایسی صورت نظر نہیں آتی جس کی واحد وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ مصنف نے شعوری سطح پر اپنے فن کو کسی خاص اسلوب اور فنی ڈھانچے کے تابع رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس نے واقعات کے فطری بہاؤ کو نہایت سادہ اور بے ساختہ سے انداز میں تحریر کر دیا ہے۔ لیکن شاید افسانہ نگار کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ اس انداز سے لکھنا اس دور میں کتنا مشکل اور ناپید ہو گیا ہے اور اس کی اس کاوش نے افسانے کے حسن، دلکشی اور تاثر کو کتنا گہرا کر دیا ہے اور یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے ابھی افسانہ نگاری کی ابتدا کی ہے۔

قاضی پیروز بخت کی بعض کہانیوں میں شخصیت نگاری کا رجحان بھی غالب ہے اور کہیں کہیں تاریخی معلومات کا عنصر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں بھی وہ کسی نہ کسی ڈھب سے کہانی کے عنصر کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ ایسی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری کو بعض شخصیات اور مقامات کے بارے میں ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جن کے متعلق

بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں گوتم بدھ کی شخصیت اور تعلیمات کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے افسانوی انداز سے (روحانی سطح پر) گوتم سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر بڑے علمی اور فلسفیانہ سطح پر کیا ہے۔ انہوں نے بڑی فنی مہارت سے بدھ مت کی تعلیمات کے فکری و نظریاتی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اور گوتم کے افکار کے بارے میں عمومی تصورات کے برعکس انہوں نے کم از کم ایک نئی جہت کو بڑی خوب صورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں غور سے دونوں آنکھوں کو دیکھا۔ سدھارتھ آلتی پالتی مارے خدا سے لو لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بند تھی جو خالق کائنات کی تلاش میں تھی جبکہ دوسری آنکھ کھُلی تھی اور اس میں پوری چستی اور چالاکی موجود تھی میں نے ان خواتین کو بتایا وہ مورتی جعلی نہیں اور نہ ہی کسی اناڑی نے بنائی ہے بلکہ مورتی ہر لحاظ سے مکمل اور مہارت کا نمونہ ہے، آنکھوں کا تفاوت اناڑی پن کی وجہ سے نہیں بلکہ مہاتما بدھ کے فلسفہ کی ترجمانی کے لئے جان بوجھ کر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس مورتی کی آنکھوں سے مہاتما بدھ کا یہ فلسفہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک آنکھ سے خدا کی معرفت حاصل کرو اور اس سے ذات سے لو لگاؤ اور دوسری آنکھ دنیاداری کے امور پر پوری ہوشیاری سے رکھو۔"

(سدھارتھ' صفحہ نمبر ۴۸)

گوتم بدھ کی تعلیمات میں اعتدال اور توازن کا یہ نظریہ بہت کم لوگوں تک پہنچا ہے، لیکن افسانہ نگار نے نہایت خوش سلیقگی سے کہانی کے انداز میں اسے قارئین تک پہنچانے کی بڑی قابلِ تحسین کوشش کی ہے۔ اسی طرح شخصیات نگاری کے باب میں انہوں نے اور بھی بہت سے مذاہب کے پیروکاروں کا ذکر کیا ہے جن میں پارسی، مسلمان اور عیسائی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ قاضی پیروز بخت نے اُردو کے اہم غزل گو شاعر شکیب جلالی سے اپنی رفاقتوں کو ایک خوب صورت کہانی کے روپ میں سمو کر اسے بالکل نئے انداز سے متعارف کروایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"شکیب نے ایک تصویر اپنی پسند کے پوز میں اتروائی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں گلاب کا ایک پھول پکڑ رکھا تھا اور ہاتھ ہوا میں آگے بڑھا رکھا تھا' اور اپنے جسم کو آگے کی طرف جھکا کر اس نے تصویر بنوائی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آپ کو گلاب کا سُرخ پھول پیش کر رہا ہو۔ وہ تو جینا چاہتا تھا، سرخ گلاب کو زندگی اور محبت کی علامت سمجھا جائے تو وہ دوسروں کو زندگی اور محبت کا پیغام دے رہا تھا لیکن دوسروں نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ کہاں وہ زندگی اور محبت کا پیغام بر تھا اور کہاں دنیا والوں نے اُسے موت کے اندھیروں میں پہنچا دیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر کی روشنی نے اُسے وہاں ضرور منور رکھا ہو گا۔"

(روشنی کا طالب، صفحہ نمبر ۵۱)

پیروز بخت قاضی کا فن بے لوث محبتوں اور معصوم جذبوں سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں ثابت و سالم کردار بھرپور زندگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ وہ تہذیبی سانحوں اور معاشرتی المیوں سے اثر ضرور قبول کرتے ہیں لیکن اپنے وجود کا فکری اور منطقی جواز رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی معنویت بڑی واضح اور رجائیت کی حامل ہے۔ ان کی کوئی بھی تحریر قاری کو زندگی سے مایوس ہونے کی ترغیب نہیں دیتی۔ اس کا فن فرد کو توانائی اور فرحت بخشتا ہے، اس لئے کہ اس کے ہاں زندگی کا تمام تر منظر نامہ فرد اور دھرتی سے ترتیب پاتا ہے اور ہر عمل زمینی رشتوں سے پیوست ہے۔ وہ حیاتِ انسانی کے ہر رشتے میں تقدس، احترام اور محبت کو نمایاں کرتا ہے۔

"جھروکے" کی کہانیوں میں مصنف کی ذات بذاتِ خود ایک حتمی کردار کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کا وجود کہیں راوی، کہیں قصہ گو، کہیں معاون ہیرو اور کہیں دانشور کے طور پر اکثر کہانیوں کا حصہ بنتا ہے جس کی وجہ سے شروع سے لے کر آخر تک کہانی کی گرفت بہت مضبوط نظر آتی ہے۔ اس کے اسلوب میں رومان کی چاشنی بھی ہے اور آلامِ زمانہ کا کرب بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہانی کہنے کے لئے ایک مربوط نظام سے غیر شعوری سطح پر مدد لیتا ہے۔ یہ نظام کہانی کار کی باطنی کیفیات سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

قاضی پیروز بخت کی افسانہ نگاری کے بارے میں اس خدشے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے اولین ناقدین اسے "شخصیت نگاری" کے فن تک محدود کر دیں لیکن شاید ان کا یہ اصرار محض چند کہانیوں میں شخصی حوالوں کی وجہ سے ہے جبکہ وہ بنیادی طور پر ایک کہانی نویس ہیں۔ اُن کا طرزِ اظہار اور لب و لہجہ، ان کے فن کے وہ بنیادی عناصر ہیں جو انہیں ایک مشاق کہانی کار کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔ انہیں اپنے تخلیقی سفر کو بغیر کسی تعطل کے جاری رکھنا چاہیئے، کیونکہ افسانوی مجموعہ "جھروکے" کی تمام تحریریں ان کے گہرے مشاہدے، مطالعے کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا فن مسلسل ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیتیں رکھتا ہے وہ زندگی کو جتنے قرب اور باریکی سے دیکھنے اور قلمبند کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں وہ بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آتی ہے۔ اس حوالے سے "جھروکے" کی کہانیاں ہمارے افسانوی ادب میں قابلِ قدر اضافے ہیں جنہیں ایک سے زیادہ بار پڑھا جا سکتا ہے۔ قاضی پیروز بخت یقیناً روشن خیال افسانہ نگاروں کی صف میں اہم مقام پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وفا راشدی کی خود نوشت

"داستانِ وفا"

ہر دور کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی پس منظر میں ستر سالہ زندگی کی آپ بیتی بھی، جگ بیتی بھی، عہد بہ عہد، سن بہ سن، برصغیر کی عہد آفریں شخصیات کے بارے میں اہم معلومات و انکشافات۔ ان کے خطوط، عکس تحریر، تصاویر اور اہلِ قلم کی آراء و تاثرات سے مزین۔

قیمت : ۱۸۰ روپے

ناشر : مکتبہ اشاعت اُردو

بی ۴۸ شاہ فیصل ٹاؤن جناح ایونیو، ملیر ہالٹ کراچی ۷۵۱۰۰-۲۷

دُوجی قسط

پھٹک

(پنجابی ھجو)

★

پرویز بزمی

شاعر ہک شخص حبیب بھٹی کول منگن واستے گیا۔ حبیب بھٹی شاعر نوں بے عزت کر کے بھجا دتا۔ شاعر اُس دی پھٹک تیار کر دتی۔ اِس پھٹک نوں شاعر صفت ثنا دے مصرعیاں نال شروع نہیں کیتا۔ پہلے مصرعے توں ای حبیب بھٹی نوں سٹھناں شروع کر دتا س۔

پھٹک حبیب بھٹی سکنہ۔۔۔۔۔

شاعر رار فدا حسین سکنہ کُنڈ ضلع خوشاب

اوہ منکر پنجتن دا جو لگے ہونس در
ما اُس دی ارجن دیکھو وچوں استر[1]
راواں نال وَدھ کے کریندا لر لر[2]
جیبا بھٹی لعنتی نسل اے کھچر
حُلیہ شیطان والا کھول کے دساواں
دُوروں دیکھ بھوکدا کیویں کول جاواں
سنیاں دے کولوں پیا نت دان پاواں
راہ دا جو اس نے نہ کیتا اے قدر
جیبا بھٹی لعنتی نسل اے کھچر
سُور وانگوں قتلی جو ہر[3] نوں اوہ مارے
کم جو شیطان والے کردا اے سارے
عزت دی گل کولوں رہندا اے کنارے

لمیاں کھکھاڑیاں تے ملا ایہہ سُوں سر
جیبا بھٹی لعنتی نسل اے کھچر
جگ تے جہان اُتے اوپرا سُوں چالا
رَڑس جے سپ اُتے اُبھرس چھالا
راواں نوں اوہ بھوکے جیویں بھوکے کُتا کالا
دُوروں دُوروں دیکھیاں جو لگدا اے ڈر
جیبا بھٹی لعنتی نسل اے کھچر
لعنت دا طوق گل اس نے جو پایا
عزت دا کم کوئی کدی نہ وکھایا
گل میں ایہہ سچی کیتی جھوٹ نہ سنایا
کھول کے فدا ساری دتی اے خبر
جیبا بھٹی لعنتی نسل اے کھچر

---

[1] استر۔ کھچر۔ [2] لر لر۔ بک بک۔ [3] ہر۔ ہر آدمی

ہُن میں جیہڑی پھٹک لکھن لگا واں ایہہ راہ جھڑنگ بنائی آہی۔ راہ دا اصل ناں امام بخش آہ۔ اوہ جھگڑالو طبیعت دا بندہ آہ۔ اس وجہ توں راہ جھڑنگ مشہور ہو گیا۔ اوہ پنجابی دا بڑا سرکڈھواں شاعر آہ۔ اوہ پنجابی دے نامی شاعر راہ شریف دا شاگرد آہ۔ راہ جھڑنگ موضع شاہ پور ضلع سرگودھا دا رہن والا آہ۔ اُس دا چھپیا ہویا کلام نہیں لبھدا۔ اوہ ۱۹۷۵ء وچ فوت ہویا اُس دے ملوتیر بابا رمضان ہوری اس ویلے ستر (۷۰) سال دے ہین تے ساہیوال ضلع سرگودھا دے وسنیک ہن۔ اوہ بڑے راٹھ تے بیبے آدمی ہن۔ اُنھاں نوں راہ جھڑنگ تے ہور کئیں پنجابی شاعراں دی بہوں ساری شاعری یاد اے ـــ

اس پھٹک بناون دی وجہ ایہہ ہوئی جے راہ جھڑنگ شاہ پور وچ مکان بناون واسطے داہ مرلے زمین خریدی۔ اوہ پٹواری کول انتقال چڑھاون واسطے گیا۔ پٹواری دا ناں ظہور آہ۔ اوہ اپنی ذات کھوکھر دسدا ہوندا آہ۔ پٹواری راہ جھڑنگ توں وڈھی (رشوت) منگی۔ راہ جھڑنگ اُس دی بڑی منت تے ترلے کیتے تے آکھیا میں غریب منگ کے کھاون والا تینں وڈھی کتھوں دیواں پر ظہور پٹواری کوئی گل ناں منی تے انتقال ناں چاڑیا۔ راہ جھڑنگ پٹواری دی کیڑ خبر لین واسطے اس دے پنڈ وچ گیا تاں لوکاں کولوں پچھ کچھ کیتیاں پتہ لگیا جے ظہور پٹواری اصل وچ ذات دا دھتبہ (چڑوا) اے تے اپنی ذات لکا کے کھوکھر سدوینداے۔ واپس آکے راہ جھڑنگ اُس دی پھٹک بنا کے مال افسر دے پیش ہو گیا تے پھٹک سُنا دِتی۔ مال افسر پٹواری نوں بلا کے ڈاھڈی توہ پھٹ کیتی تے سخت جھاڑ پا کے اُس نوں حکم دتا جے ہُنیں راہ دا انتقال چاڑ کے تحصیلدار کولوں تصدیق کروا کے میںوں آکے وکھا۔ راہ جھڑنگ دی زمین دا انتقال وی چڑھ گیا تے پٹواری راہ دی پھٹک دا نشانہ وی بن گیا۔ راہ جھڑنگ دی پھٹک ایہہ ہیوے۔

پھٹک ظہور پٹواری (تعینات) شاہ پور

شاعر: راہ امام بخش جھڑنگ سکنہ شاہ پور ضلع سرگودھا

الف اللہ حق سبحان
پاک رسولؐ نبی لاثان
پنجتن پاک دا اعلیٰ شان

ہن کجھ سیداں[1] دُدھ لکا کے پالیا شوق شکار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راہ جھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

وچ آواز دے برکت پاؤ لوڑ میںوں اشعار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راہ جھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

مال افسر نوں کراں دعائی
اس پٹواری نوں بدلائی
شاہ پور دی جان چھڑائی

ایہہ پٹواری ناں ظہورا
دوڑ گاگل ڈگ کتورا
پہلوں جمیا خاص ادھورا

موقع ویکھ مکان میرے دا کے نیت بدکار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راہ جھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

---

[1] سیداں: شاہ پور دے سردار تے بااثر سادات جیہڑے ظہور پٹواری نوں دُدھ، گھیو تے دانے وی دیندے آہن تے اس دی سرپرستی وی کردے آہن۔ (گاٹے۔ گردن۔ گچی۔ گلا)

میں جاتا کھوکھر لجپال
راجھڑنگ دے ہوکے نال
دیم سب جداد سنبھال
موماں ہار مُدبّر چہرہ وچوں رسم کفار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

گل پٹوار یار رکھیں یاد !
رب کرے تیتھن ہووے باد
جھگا ہووی سب برباد
ملک الموت ترے گھر آکے تسبیح پڑھے قہار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

اوپری چال دا ایہہ پٹواری
وگس وِق تے ہووے ازاری
روگی رہے وچ عمراں ساری
بودھے دا محتاج رہے ہتھ بوتل ہوس دینار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

اس ملعون نوں لج نہ کائی
سرد مزاج دماغ ہوائی
لُچا لنڈا بہت زناہی
خشکی خورا بہت لڑاکا چوڑ کرے نسوار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

کھنب چھپا کل اس دی ذات
بن دا کھوکھر نیک صفات
لے کے ہتھ وچ قلم دوات
جھوٹے خسرے فرد لکھا کے وڈھی لئے کھلواڑ دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

ٹوپے من نسوار دے پھکے
شرم حیا دی اکھ نہ تکے
لڑے اُٹھائیں جتھوں لکے
جمدیاں ماں گھتیندی اس نوں گھُٹی سنبل فار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

اس وڈھی دا کراں ثبوت
رل چھپیا نہیں دونویں توت
بھل ویسیں تیتھن سب کرتوت
جھر جھر پیا کریں توں جیویں بوڑی نینڈ جھلار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

جٹاں دی بھُوں لاہی رنگ
خلقت پے گئی اس توں تنگ
بن سٹھیس را جھڑنگ
وچ عدالت دے جھگڑیساں باتشاہی سرکار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

خط کشید الفاظ : دلیم ۔ مینوں دلیسی ، جداد ۔ جائیداد ، بودھا ، شاہ پور دا اک ہندو حکیم ، دینار ۔ شربت دینار ، کھنب چھپا کل ۔ کپڑے دھون نے کھنب چاڑن والا ۔ ذات دا دھبہ ، توت ۔ چوپنا ۔ تکلیف اٹھانا ، دونویں ۔ دونوں ، باد ۔ تپ بیماری ، جھگا ۔ گھر بار ، چوڑ ۔ تباہی ، سنبل فار ۔ سنکھیا ۔

سیّد اس دی مدد کریندے
مجّیں گھروں لیاریاں دیندے
دُدھاں چُوریاں نال پلیندے
دلا آغا لس سیّداں دا ایہہ لیندا فیس ہزار دی
مال افسر دے بھاگ سلامت عرض سنو بیمار دی
راجھڑنگ دے گاٹے اُتے ویکھ چھُری پٹوار دی

اُردو شاعراں جیویں مزاحیہ ہجواں لکھیاں مثلاً "مصحفی دی" چارپائی" دی ہجو تے سودا دی "گھوڑے" دی ہجو انجے ہار پنجابی شاعراں وی ہنساونیاں پھٹکاں بنائیاں ہیں۔ مضمون ختم کرن توں پہلاں نمونے دے واسطے ہک ایہو جہی پھٹک لکھداواں۔ ایہہ پھٹک ہک کُتی (کُتیا) دی پھٹک اے۔ ایہہ وی راز امام بخش جھڑنگ بنائی آہی۔ شاعر موضع "اچھر" ضلع شاہ پور وچ گیا ہویا آہ۔ اوتھے اوہ چوہدری ولی داد دے دارے تے بیٹھا ہویا آہ۔ چوہدری نوں تریہہ لگی۔ ویکھیا تاں گھڑیاں وچ پانی ختم ہویا پیا آہ۔ ہور بندا اُس ویلے دارے تے آہ کوئی ناں چوہدری، شاعر نوں آکھیا جے ایہہ نال ای موچیاں دے گھروں پانی لے آ۔ راز جھڑنگ اُٹھیا تے پانی لین واسطے دارے توں تھلے اُتریا۔ نال ای ہک ٹبے تے ہک کُتی بیٹھی آہی۔ اوہ پردیسی تے بیگانیاں بندیاں نوں چُپ چپائی لڑ ویندی آہی۔ اوہ راز جھڑنگ نوں پیتے گئی۔ جھڑنگ ڈھیہہ پیا تے موہنوں حال حال نکلی۔ لوکاں بھج کے جھڑنگ نوں چھڑایا۔ شاعر امام بخش جھڑنگ اُس کُتی دی پھٹک بنا دتی۔

پھٹک کُتی از راز امام بخش جھڑنگ

ہک دن امرِالٰہی ہویا "اچھریں" راز امام گیا
چوہدری ولی داد دی خاطر لین پانی دا جام گیا
داریوں اُبھے موچیاں دے گھر پانی آہا عام گیا
داریوں تلے لہنا حکم، پیئوم قضیا بھارا جی
اِچّن چیت چھپا کل کُتی راز جھڑنگ نوں تک گئی
چُپ نکر دھّن، سادری سادھّن ٹبے توں لے دھرک گئی

جادوگرنی پتہ نہ دِتا دھر سکرنگ تے چک گئی
ٹنگا نپ زمین تے ڈھائیوس بھل گیا ہوش پسارا جی
شہر اچ پھرے چپاتی ظالم، سادھو شہر دے تارے جی
باہروں آئیاں توں دُکھ سُکھ پُچھے منتر ٹنگوں جھاڑے جی
راہیاں نوں ایہہ منتر جھاڑے ٹک کے نیک دہاڑے جی
رب کرے اِس سادھّن دا شالا اسٹرس ٹھاکر دوارا جی
(ختم)

خط کشید الفاظ: اِچھریں۔ موضع اچھر وچ، داریوں۔ دارے توں، پیئوم۔ مینوں پیا، دھرک۔ چھلانگ ٹکرنگ۔ کمزور ٹنگ، ڈھائیوس۔ گرا دِتا، راہیاں۔ مسافراں، ٹر جاتے۔

سلیم کاشر

غزل

اَگے اَگے مہندی دی خوشبو آئی
پچھے پچھے وانگ پرے دے اوہ آئی

چِٹنے چانی چوئی وچ دیجھاں دے
یا تارے سیارے دی گھر لو آئی !

سارا ویہڑا جگمگ جگمگ کر اُٹھیا
والاں نال ٹُٹھنے رُت پرو آئی

مستی نال پُرچی مہک گلاباں دی
پچھلی راتیں خورے ٹھیکیوں ہو آئی

خوشیاں دے وچ ڈُبی رات وصالاں دی
دُوریاں والے ہِردوں اُلاہمے دھو آئی

اکھیاں اندر جاگے خواب حیاتی دے
کیتی اے تعبیر دِلے وچ جو آئی

کیوں نہ پینگاں پاوے جِنڈری امبراں تے
جگ دی ٹیڑی اکھ وچ سُول چبھو آئی

گرم ہَوا جدھروں آوندی سی ساڑن نوں
پیار ہنیری اُس رُکھڑکی نوں ڈھو آئی

تھل نوں پیاسا دیکھ کے بارش روندی رہی
لگدا کِدھرے سخیاں کول کھلو آئی

اَج ہَوا پئی وکھریاں مہکاں دان کرے
ٹُردے صندل رُکھ نوں خورے چھو آئی

دریا کنڈھے کاشر کوٹھا پا کے وی
دِلبر وچ دریا دی کوئی نہیں خُو آئی

انور سدید

غزل

کوئی نہ کر سکدا گمراہ
پیر اے میرا بُلھے شاہ

دیوا بال بنیرے رکھ
جھاتی مار کے دیکھ لے راہ

اوہ ڈیرے تے پہنچ گیا سی
ساڈا سُک گیا راہ وچ ساہ

اوس نوں مل گئی اُچی کرسی
ساڈے گل وچ پے گیا پھاہ

اوس نوں ووٹ تے نوٹ ملے نیں
کوئی نہ پاوے سانوں گھاہ

اوہ کدی تے آوے گا !
جس دی ساڈے دل نوں چاہ

انور آپ دھمالاں پا !
لوکی کہن گے واہ بھئی واہ

ہارون عدیم

سفر دے اندر سفر

سارے پینڈے
ساریاں واٹاں
اِک نقطے توں
دوجے نقطے تیکر نیں
گڈی روز ای
اک ٹیشن توں دوجے ٹیشن جاندی اے
سُنج مسنجیاں تھانواں وچوں
اوکھیاں اوکھیاں راہواں وچوں
ہسدے وسدے شہراں وچوں
راوی اتے چناواں اُتوں

چن وی روز ای
اَج دے وانگوں
اَن ڈٹھے دریاواں وچوں
سر کڈھدا تے
رُکھاں اتے پہاڑاں کولوں
اُچا ہو کے
رات دے سارے علاقے گاہ کے
گڈی وانگوں
اوڑک جا کے ڈُب جاندا اے
اکھاں دے لئی
بُجھ جاندا اے

پر سیٹیاں مار کے بھجدی گڈی دی کھڑکی چوں
کالیاں کالیاں رُکھاں اُتے
ہسدے وسدے پورے چن نوں
گڈی دے نال بھجدیاں تک کے
مَیں ایہہ سوچاں
اوہدے ولّے
میرا پینڈا اُنکدا کیوں نئیں
پیر کِتے دی رُکدا کیوں نئیں

لطیف قریشی

بے عقلاں

بُرا حال ہویا پنجاب دا
تے بُلھے شاہ انج ماتم کیتا
مغلاں بھنگ پیالے پیتے
بھوریاں والے راجے کیتے

اَج پاکستان دا حال بُرا اے
اَج دی بُھلے شاہ کہندا اے
عقلاں بھنگ پیالے پیتے
بے عقلاں تھیں راجے کیتے

محمد اقبال نجمی

حکایت

اک قیدی نے اِک حاکم توں موت سزا جد پائی
مایوسی دی حالت وچ اُس کیتی حال دہائی
حاکم نوں اُس مندا کہیا نالے گالاں کڈھیاں
شور شرابہ کیتا جو وی مونہہ آیا کہہ چھڈیاں
حاکم پچھیا کیہہ آندا اے قیدی ٹریا جاندا
نیک وزیر نے دسیا اوہنوں قیدی ایہہ گل آندا
چنگے اوہ لوک نیں جیہڑے پیندے اپنا غصہ
کر دیندے نیں معاف خطاواں ایہہ اوہناں دا شیوہ
حاکم گل سُنی تے اوہدے رحم چا دل وچ آیا
اس قیدی نوں معاف کرن دا حکم اوہنے فرمایا
دوجا اک وزیر سی جیہڑا ہور طبیعت رکھدا
آکھن لگا سچی گل اے میں چُپ نئیں رہ سکدا
اصلیت تے پردہ پایا تساں نئیں کیتا چنگا
ایہہ قیدی تے حاکم تائیں بول رہیا سی مندا
سُن کے گل وزیر دوجے دی حاکم مونہہ پرتایا
اپنے ایس وزیر تے اوہنوں ڈاھڈا غصہ آیا
حاکم ایہہ گل آکھی اوہنوں بول اے تیرا سچا
تیری بھیڑ طبیعت دا پر اس وچ شامل حصہ
اوہ ہے سچ دی بھیڑا جس تھیں کریئے فتنہ پیدا
کسے دی جیدے وچ بھلیائی اوہ ہے جھوٹھ دی چنگا

سلیم شہزاد

اِک نظم

(۱)

کاں اساڈیاں اکھاں دے وچ
جدوں گھوری پائی
شام نماشیں سڑدی بلدی
دُھپ نوں چھڈن آئی

(۲)

من تنادیں پا کے
کھوکھے لے کے پُرتے ساں
گھر بنیرے چُک کے سارے
بوہے اُتے بیٹھے ساں
شک دے ٹھنڈے پیراں اُتے
چنبل سی حریانی دی

تنویر نوازش

غزل

عشق وفا دے جھگڑے جھیڑے !
کیہڑا سمجھے ؟ — کون نبیڑے !
کون چتارے ------ درد پرانا
کیہڑا ستے ناگ نوں چھیڑے
ہیر نہ موہرا کھا کے مَردی
جے کھیڑے نہ پیندے کھیڑے
شہہ رگ تے ہے بہت دُوراڈی
سجناں ہور دی آجا نیڑے
ساہتھے گند اچھالن والے
پہلوں اپنے ہتھ لبیڑے
عشق دا ویہڑا چھڈن والے
رُل جاندے نیں ویہڑے ویہڑے
ہجر تیرے دی پیاس نہ لتھی !
کھوہ نیناں دے ہر دم گیڑے
دو پل ہجر دا پینڈا کیتا !
ساری زندگی رہے تھکیڑے
کیہہ کیہہ یار دی نیکی دساں
پھَٹ وِکھاواں کیہڑے کیہڑے
جان دے ویری بن گئے اوہو !
جان توں پیارے ہے سَن جیہڑے
کنڈھے لاسیں پیر نوازش
ساڈی آس مُراد دے بیڑے

فہیم شناس کاظمی

اپنی موتے مَردا

جے میں صحرا دا پھل ہوندا
کیہڑی رُت اِچ کھِلدا
کیہڑے منظر دے وچ رہندا
کیہڑیاں وا واں جھلدا
آندے جاندے قافلے تکدا
میں روندا یا ہسدا
کِنیاں گلاں وانوں دسدا
کِنیاں دل اِچ رکھدا
چانن رات دے اندر نچدا
دِنے دُھپ اِچ سڑدا
اپنی ذات دے کھُوہ وچ لہہ کے
اَج میں بیٹھا سوچاں
کُوڑیاں گلاں اُتے جیکر
میں اعتبار نہ کردا
اپنی حیاتی آپ میں جیندا
اپنی موتے مردا :
ناں فیر ہو کے بھردا
جے میں صحرا دا پھُل ہوندا

اعجاز روشن

غزل

اِک اِک کر کے میرے سارے بیلی اُٹھدے جاندے نیں
رب جانے کیوں دنیا وچوں ہاسے مُکدے جاندے نیں

پُھلاں دیاں شکلاں بُھلے مالی دی اس دور دے وچ
باغاں وچوں کٹیاں ہوئیاں لاشاں چکدے جاندے نیں

اپنا وی کوئی دُکھ اے سجنو، ایویں جہی کوئی شے جیویں
دُنیا وچ ہر دل دے اندر بھالے ٹھکدے جاندے نیں

دو قدماں دی دُوری لئی میں کناں پینڈا تُریا واں
پَیر پَیر تے اپنے لوکی راہ پئے رُکدے جاندے نیں

جنگل جنگل آس دا پنچھی لوڑے جیہڑیاں چھانواں نوں
سدھراں دے اوہ رُکھ گھنیرے ہر پل سُکدے جاندے نیں

دُنیا داری کر کے روشن دل اپنا توں کیتا کالا !
ہر دم اَکھ وچ چمکن والے تارے لُکدے جاندے نیں

آصف شفیع

غزل

دیوا عشق دا دل وچ بال
جندڑی نوں ناں ایویں گال

اپنے مونہوں کیہہ میں دساں
دل دیاں گلاں دل دے نال

اوہ ای پُٹھی پئے گئی مینوں
جیہڑی وی میں چلی چال

پلّے بنھ لے گل ایہہ میری
دنیا دریاں دا اے جال

یارب سچیا ! سُن لئے میری
میرے سر توں آفت ٹال

آصف چنگے لوکاں دا وی
دنیا تے ہن پے گیا کال

انجمنِ خیال

(خطوط)

پیارے اظہر جاوید!

میں اگر کہوں کہ تمہارا پرچہ بہت اچھا ہو گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی کیونکہ یہی بات بہت سے لوگ تمہیں بڑی تکرار سے بتاتے رہے ہیں مگر ایسی آرا کو بالعموم رسمی قرار دیا جاتا ہے جب کہ میں بالکل غیر رسمی بات کر رہا ہوں۔

تمہیں معلوم ہے میں گزشتہ ایک برس سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوں۔ علاج میرا تو یہیں لاہور کے شوکت خانم ہسپتال میں کچھ دوستوں اور کچھ سرکار کی مہربانی سے مکمل ہو گیا تھا مگر ہسپتال والوں کا مشورہ تھا کہ میں فائنل چیک اپ کے لئے امریکہ ضرور جاؤں چنانچہ کچھ دوستوں کے تعاون سے میں اس مقصد کے لئے انگلستان اور امریکہ گیا تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد واپسی پر دسمبر کا تخلیق ملا تو مجھے اس کے مندرجات، ضخامت حتّٰی کہ اشتہارات دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا تمہاری محنت اور لگن بالآخر رنگ لا رہی ہے اور برصغیر کے لکھنے والوں کی توجہ اس پرچے کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ساتھ ساتھ اشتہارات کی رونق بھی نظر آنے لگی جس کے بغیر اس کاروبار کا جاری رہنا مشکل ہے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ پرچے کی طباعت اور ترسیل پر اب بھی تم گرہ ہی سے کچھ خرچ کر رہے ہو۔ اس میں مالی فائدے کے امکانات تو کم ہی ہیں البتہ جذباتی آسودگی کا سامان ضرور مہیا ہو سکتا ہے۔ میرے لئے خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے اُردو ادیبوں سے پاکستان کے لکھنے اور پڑھنے والوں کا جو رابطہ منقطع ہو گیا تھا، تخلیق نے اسے دوبارہ بحال کر دیا ہے۔ تمہارے پرچے میں اُردو کے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی نمائندگی کافی بھرپور ہے۔ یہ کام خود بخود تو نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی محنت درکار ہے جو تم مسلسل کر رہے ہو جس کی وجہ سے یہ کامیابی ہوئی ہے۔ میری طرف سے اس پر مبارکباد۔

دسمبر کے پرچے میں شروع کی دونوں کہانیاں ہندوستانی ادیبوں کی تخلیقات ہیں اور دونوں ہی کمال کی چیزیں ہیں۔ ویدراہی کا افسانہ "جنازہ" پڑھ کر تو میں سناٹے میں آ گیا۔ یہ اس لئے بھی کہ میں خود اپنا شمار ہریش چندر جیسے بے لوث لوگوں کے عقیدت مندوں میں کرتا ہوں، خود ہم نے اپنی زندگی کا آغاز ایک ایماندار سیاسی کارکن کی حیثیت میں آغاز جوانی ہی میں کیا تھا اور دنیا کو بنانے سنوارنے کی جدوجہد میں لگے رہے۔ دنیا تو سدھرنے کی بجائے اور بگڑ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارا حشر بھی خراب ہوا، ہریش چندر جیسے کردار ہندوستان اور پاکستان میں بکثرت موجود ہیں اور یہ سب لوگ نامرادیوں

اور ذاتی محرومیوں کے باوجود اپنے کئے پر نادم نہیں ہیں۔ 'جنازہ' کے ہیرو ہریش بھی اپنی کس مپرسی اور زبوں حالی کے باوجود عظیم انسان نظر آتے ہیں اور ان کے لئے ہمارے دلوں میں عزت اور احترام کے جذبات ہی ابھرتے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے لوگوں کی پذیرائی اب اس طرح نہیں ہوتی جس طرح چند برس پہلے تک ہوتی تھی مگر بہرحال ان کو قابلِ احترام ضرور قرار دیا جاتا ہے۔

مجھے اس سلسلے میں حال ہی میں کچھ حوصلہ افزا ذاتی تجربات بھی حاصل ہوئے۔ گزشتہ کئی برس سے میں گوشہ نشین ہی نہیں بے روزگاری اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دل میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ ہم نے اپنی زندگی شاید ضائع کر دی ہے۔ میری بیوی تو اکثر کہتی تھی کہ ہم مریں گے تو شاید ہمارا جنازہ پڑھنے والے بھی مشکل ہی سے دستیاب ہوں گے۔ میں اگرچہ اس سے اختلاف کرتا اور اسے تسلی بھی دیتا لیکن یہ وہم میرے دل میں بھی موجود تھا کہ اگرچہ ہم نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا مگر دس پندرہ برس پہلے تک ہمارے جیسے پرانے سیاسی کارکنوں کی قدر کرنے والے بہت سے لوگ ہمارے آس پاس موجود تھے جو ان لوگوں کا خیال رکھتے تھے جنہوں نے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ہماری طرح مکان، جائیداد بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی بینک بیلنس بنانے پر توجہ دی۔ لیکن اب جو ہماری زندگی کا پیٹرن بن گیا ہے اور جس طرح احترام اور عقیدت کا معیار صرف پیسہ بن چکا ہے اس میں ہمارے جیسے لوگوں کا حشر بہت خراب ہوگا اور اگر عرصہ حیات طول پکڑ گیا (جو طول پکڑ چکا ہے یعنی زندگی کا ۷۳واں سال چل رہا ہے) تو پتہ نہیں کیسے نامساعد حالات میں سے گزرنا پڑے۔

میری حالیہ بیماری میں یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ اخبارات کے ذریعے جب میرے [illegible]ر کی بیماری میں مبتلا ہونے کی خبریں باہر نکلیں تو تم یقین کرو کہ دوستوں، جاننے والوں اور معمولی شناساؤں تک نے جس طرح ہمدردی محبت، پریشانی میں دست گیری کی کوششیں کیں ان کو بیان کرنا مشکل ہے۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں، نہ ہی میں اپنے تئیں اس قابل سمجھتا ہوں کہ میرے لئے لوگ اتنی پریشانی کا اظہار کریں۔ میں تو ایک معمولی آدمی ہوں جس میں اگر کوئی خوبی ڈھونڈی جائے تو یہ ملے گی کہ زندگی بھر ایک لائن پر چلتے رہے۔ اپنی ذات کی بجائے بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے کوشاں رہے۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوتے وہ ایک الگ بحث ہے مگر بس ایک ہی دھن میں ساری عمر بتا دی، اس کا جتنا صلہ مجھے بیماری میں دوستوں، ہمدردوں اور مختلف اداروں کی طرف سے ملا میں اپنے آپ کو قطعی اس کا مستحق نہیں سمجھتا، مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس وجہ سے میں آسانی کے ساتھ مر ضرور سکتا ہوں، میرے لئے خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے نے ہمارے اندیشوں کے برعکس ایسے لوگوں کو فراموش نہیں کیا جنہوں نے زندگی بھر اپنے ذاتی مفادات کی بجائے اجتماعی مفادات کے حصول کی جدوجہد کی، وہ کچھ کر سکے یا نہیں، یہ الگ بات ہے مگر لوگوں میں ان سے ہمدردی کا احساس موجود ہونا ہی کافی ہے۔ میں سمجھتا ہوں پاکستان میں شاید ابھی کسی ایماندار کارکن کو ہریش چندر جی جیسے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اگرچہ مشکلات ضرور درپیش رہیں گی۔

دیکھو بھئی بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تعریف میں تمہارے پرچے کی کرنے بیٹھا تھا، بیچ میں اپنا دکھڑا لے بیٹھا خیر دونوں میں تعلق سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال "جنازہ" ایک نہایت خوب صورت، مؤثر اور حقیقت پسندانہ

کہانی ہے۔ سریندر پرکاش کا داؤ رنگ اور فلارس بھی معرکے کا افسانہ ہے، ایک آدھ اور اچھی کہانی بھی موجود ہے مگر بہر حال دسمبر کے شمارے میں کامیابی کا سہرا ہندوستانی لکھاریوں کے ہاتھ رہا۔

میں نے شعر فہمی کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور اس بارے میں میرا ایک ہی معیار ہے جو شعر یا اشعار دل پر اثر انداز ہوں انہیں میں اچھا کہتا ہوں اور جو سر پر سے گزر جائیں ان پر غور نہیں کرتا مگر دسمبر کے اس شمارے میں حسین شاہد کی پنجابی نظم بڑے معرکے کی چیز ہے اور یہ بلا شبہ ہمارے قومی ترانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے بس میں ہو تو میں یہ سنانے کے لئے پبلک جلسوں کا اہتمام کرنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھوں۔ بہت خوب صورت نظم ہے اور ہمارے حسب حال بھی۔

اچھا بھائی اب رخصت، ایک اور بات یہ کہ زندگی کے بدترین لمحات میں نے ہمیشہ اچھی کتابوں کی مدد سے گزارے لیکن اس بیماری میں چند ماہ پہلے تک جب میں پڑھنے کے قابل بھی نہ رہا تو تم سمجھ سکتے ہو مجھ پر کیا گزری ہو گی۔ خدا کا شکر ہے اب پھر پڑھنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تو شائد لکھنے کا مرحلہ بھی طے ہو جائے۔ اگر میری اس تحریر میں بے ربطی کا احساس ہو تو اس کی وجہ میری بیماری ہے، توقع ہے کہ چند روز بعد لکھنے کے قابل بھی ہو جاؤں گا ایسا ہوا تو اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے کا سلسلہ جو میں نے شروع کر رکھا تھا اور جو سال بھر سے ٹھپ پڑا ہے سب سے پہلے اسے مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

مخلص : حمید اختر

مکرمی اظہر جاوید صاحب :

السلام علیکم۔ تخلیق کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی ایڈیٹنگ اور گیٹ اَپ بہت پسند آئی ہے۔ افسانوں کے انتخاب کی داد اس لئے بھی کہ اس سے بھارت اور پاکستان کے فکشن کے رویّوں کا بخوبی علم ہوتا ہے اور کہانی کے اسلوب اور اس حوالے سے متوقع قاری کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ دونوں جانب کے فکشن نگار اپنے فن پر نظر ثانی کرنے میں کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور وہ باتیں دہرا رہے ہیں جن کی شاید زمانے کو میسّر موضوعات کے پیش نظر حاجت نہیں ہے۔

بُشریٰ اعجاز کا سفر نامہ پڑھا۔ پروفیسر (پرنسپل) رمیش کمار صاحب کے ہاں انہوں نے جن صوفی بزرگ کی تصویر دیکھی تھی وہ بابا فرید شکر گنج کی تھی۔ ان کے افکار گرنتھ صاحب میں موجود نہیں۔ غلام فرید تو ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں فوت ہوئے ہیں۔ ازراہِ کرم اگر پرنسپل صاحب سے ایسا تغافل نظری ہوا ہے تو میری طرف سے معذرت کر کے ان کی توجہ اس جانب مبذول کر کے ممنون فرمائیں۔

بُشریٰ اعجاز کے سفرنامے سے اُردو کی بے سروسامانی کا مشرقی پنجاب مین پڑھ کر قلق ہوا کیونکہ سکھ حضرات اور دوستوں کا تو اُردو کے قدردانوں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ بمبئی، مدراس اور کلکتہ اور بنگلور سے تو اُردو کے رسالے شائع ہوتے ہیں اور کشمیر کی سرکاری زبان اُردو بھی ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ مشرقی پنجاب میں اُردو کو کون سی وجوہ کی بناء پر گم کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ مشرقی پنجاب کی شعری لفظیات میں اسلامی تصوّرات کا خاصہ عمل دخل ہے۔ جالندھر سے ایک غزل کا شعر سنا تھا، ۳۰ سال قبل کی بات

بے ۔ ۔ میں کعبہ کعبہ پکار رہیا میٹوں بُت ملیا بُت خانے دا

گورمکھی کا رسم الخط تو سترہویں صدی میں تخلیق ہوا تھا۔ پنجاب کا بٹوارہ بھی اسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے جس کی سکھوں کی حکومتوں نے بھی کوئی تلافی نہیں کی تھی۔

تبرکاً بابا فرید کا ایک شعر لکھ رہا ہوں: ؎

جے توں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ اپنے گریواں وچ سر نیواں کر دیکھ

اس شعر میں آپ کو دو آوازیں سنائی دیں گی۔ اوّل انسانی صدا ہے۔ دوئم صدائے رحمانی ہے۔

والسلام: آپ کا جیلانی کامران

برادرِ محترم اظہر جاوید، خدا آپ کی جوانی صدا[1] سلامت رکھے۔

تخلیق کا شمارہ دسمبر ۹۶ء ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ابھی تک تو اس کی ورق گردانی ہی کر سکا ہوں کیونکہ پرچہ خاصا ضخیم ہے۔ بہرحال انجمنِ خیال میں آپ کا ادارتی نوٹ بڑے غور سے پڑھا اور خوشی ہوئی کہ اسے غیر معتبر قرار دے کر اندازِ گفتگو درست کرنے کی تلقین کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ بھی بزرگوں میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ دوسروں کو ڈانٹ ڈپٹ سکیں۔

میں نے اس کالم نگار کا انگریزی کالم دوبارہ پڑھا جس میں آپ نے لفظ LEVITY پر اعتراز[2] کیا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس لفظ کا مطلب اس طرح درج ہے:

HUMOROUS ATTITUDE, ESPECIALLY TOWARDS MATTERS THAT SHOULD BE TREATED WITH RESPECT

میرے خیال میں اس کا ترجمہ چھچھورا پن نہیں بنتا۔ میں زبان دانی کا دعویٰ نہیں کرتا، ممکن ہے میں غلط ہوں۔ اسی طرح RIDICULOUS کو بے ہودہ نہیں کہا جا سکتا۔ لغت میں اس کا مطلب ہے **Not Worth Serious Consideration**

جس کالم نگار کو آپ نے معتوب قرار دیا ہے اس نے نہ کسی کی تضحیک کی ہے نہ تحقیر۔ اس غریب نے تو صرف تنقید کی ہے جس کا حق اس سے چھیننا میرے خیال میں سراسر ناانصافی ہے اور پھر اس نے ناصر شہزاد کے جس شعر کو خاص طور پر نشانہ بنایا ہے اس کے بارے میں اسی شمارے میں اس کالم نگار سے کہیں بڑے ادیب اور شاعر جعفر شیرازی کی رائے بھی موجود ہے۔

وہ کالم نگار ناصر شہزاد کو تو ذاتی طور پر نہیں جانتا مگر ظفر اقبال تو اس کا کلاس فیلو رہا ہے۔ لا رکالج میں جب وہ کالم نگار مجاہد ترمذی کے ساتھ میزان کے انگریزی سیکشن کا انچارج تھا تو ظفر اقبال اُردو سیکشن کی ادارت سنبھالے ہوتا تھا اس کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اس کے اشعار پر اعتراض کرنا اس کا حق ہے۔ بہرحال اگر اُس کالم نگار کی کسی بات سے آپ کو یا کسی شاعر گرامی کو دُکھ پہنچا ہو تو بھی اس کی طرف سے معافی کا خواستگار ہوں۔ امید ہے آپ اسے بخش دیں گے۔

فقط آپ کا معترف: اشفاق نقوی

---

[1] سدا، [2] اعتراض۔

اب بتایئے، لفظوں کے اِملا، معانی اور استعمال کی بحث آگے چلے؟ (ادارہ)

محبی و مکرمی اظہر صاحب ۔

بہت بہت سلام۔ محبتیں اور دعاہائے صحت و سلامتی قبول فرمایئے۔ یہاں آج کل نزلے کا زور ہے۔ جمعہ کو لندن میں ایک ادبی تقریب تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے زیادہ تر لوگ سخت زکام اور بخار میں مبتلا ہو گئے۔ عمران الارشد، حمایت علی شاعر اور بانو ارشد کی حالت زار کا علم گزشتہ شب فون پر ہوا۔ غالباً اسی فون کے ذریعے جراثیم یہاں بھی پہنچ گئے چنانچہ صبح سے میں بھی "علیل" ہوں۔ مدتوں بعد ایک، چھوٹی موٹی علالت ملی ہے لہٰذا خوب دھم دھام سے بیگم سے خدمت کروا رہا ہوں اور رعب جھاڑ رہا ہوں (حقیقت حال کا ان کو علم ہے لہٰذا پوری توجہ سے تیمارداری نہیں کر رہی ہیں)۔

اسی عالم میں آپ کا قیمتی اور بہت عزیز پرچہ ملا۔ بقول کسے ..... ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے والی کیفیت ہو گئی۔ خوب پڑھا، بعض چیزوں پر نظر ثانی بھی کر رہا ہوں۔ آپ سے سچی سچی باتیں کہتے کسی طرح کی جھجک نہیں ہوتی اس لئے بلا تکلف لکھ رہا ہوں ۔

(۱) میں آپ پر "کرم" نہیں کر سکتا۔ ایک طرح کی اپنائیت اور قرب ہے اس لئے ممکنہ خدمت کی کوشش کرتا ہوں۔

(۲) اخبار اور رسائل کے مدیر اپنے قارئین کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی کبھی عدالتوں میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان کی بنیادی ذمہ داری — یا حق یہ ہے کہ وہ قطع و برید سے کام لیں۔ اگر کوئی تحریر ناشائستہ ہے یا جس سے غیر ضروری فساد کا خطرہ ہے تو آپ حاکم اعلیٰ ہیں اور آپ کے فیصلے کے خلاف عذر داری بھی حماقت ہو گی۔ آپ نے ادبی جھگڑوں میں کبھی کوئی قطع و برید نہیں کی لیکن غیر شائستہ کلمات کو حذف کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ادیب کتنا ہی قدآور کیوں نہ ہو اس کی تحریر عشائے ربانی نہیں ہوتی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مہمل باتوں کو حذف کرنے میں مروت سے کام نہیں لیا۔ اس بار تو یہ بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے "ثوابدید" کی صحت فرمائی ورنہ پچھلے شمارے میں ایک اچھے خاصے معقول ادیب نے ہدف کو حدف لکھا تھا اور آپ نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

(۳) رام لعل کے فن پر میں نے کچھ نہیں لکھا۔ میں نے ایک قرض کی ادائیگی کی طرح کچھ تاثرات لکھے۔ ان کو لاہور اور پنجاب سے جو عقیدت تھی اس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے بیش قیمت اوراق میں یہ تاثرات کھپ سکیں۔ لیکن غلام الثقلین نقوی اور انور سدید کے مضامین کے بعد مزید کچھ کہنا آپ کے صفحات پر غیر ضروری بوجھ ڈالنے کے برابر ہے، لہٰذا اب اس کو جانے دیجئے ۔

۴ ۔ میں اپنے بارے میں کسی بات کا برا نہیں مانتا۔ اگر بے تکی نکتہ چینی بھی ہو تو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا لیکن زیر نظر شمارے میں محترم خالد اختر صاحب کا جملہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ "مری سننے لگے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے" دوستانہ اور ادبی تبادلۂ خیال ایک مستحسن فعل ہے جبکہ کسی نفسیاتی پیچیدگی کی بنا پر تنقید محض کا درجہ کبھی بھی سوء ادب سے آگے نہیں بڑھتا۔

یہ سطریں آپ کو نئے سال کے قریب ملیں گی لہٰذا خلوص دل سے آپ سب کو سال نو کے لئے بہترین خواہشات کا نذرانہ بھیج رہا ہوں۔ اگر حالات سازگار رہے تو رمضان کے بعد شرف نیاز حاصل کروں گا ۔

آپ کا معترف ۔ قیصر تمکین (لندن)

برادرم اظہر جاوید۔ تسلیم

آپ کرم کرتے رہے ہیں۔ تخلیق جیسا پُروقار جریدہ ماہ بہ ماہ زیادہ پُروقار ہوتا جارہا ہے۔ تازہ شمارہ (دسمبر) بھی بھاری بھرکم ہے۔ مجھے ظفر عظیم کے تراجم بطور خاص پسند آرہے ہیں وہ اہم مضامین کے تراجم کے ذریعہ اُردو قارئین کے لئے فکر و نظر کے نئے دروازے کھول رہے ہیں۔ حصہ نظم میں خواتین شعراء کی تعداد خاصی ہے۔ اچھا ہے کہ یہ رجحان برقرار رہے۔ سریندر پرکاش کا افسانہ حسبِ توقع بہت اچھا ہے۔ وہ اس دور کے اہم اور مؤثر افسانہ نگار ہیں۔ خصوصی مطالعہ کے سیکشن میں اپنے دوست شفیع عقیل کے بارے میں اچھی تحریریں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کاش مجھے اس سیکشن کے بارے میں پیشگی اطلاع ہوتی تو میری تحریر بھی شامل ہو سکتی تھی لیکن خیر یہ کہیں اور شائع ہو جائے گی۔

قتیل شفائی صاحب کی نظم "کئی برسوں کے بعد ایک نظم" جن کیفیات کی حامل ہے۔ وہ بذاتِ خود اس تجربہ پر جو خاصہ آفاقی ہے۔ صاد کرتی ہے کہ ہم پرانی یادوں کی یافت بلکہ گرفت کے لئے ہی نئی یادیں تخلیق کرنے میں منہمک رہے ہیں یوں لگتا ہے کہ آج کل قتیل شفائی بعض ایسے تجربات سے گزر رہے ہیں جو عمرِ گزشتہ اور عمرِ گزراں میں چنداں فرق نہیں رہنے دیتے۔

بعض غزلیں بہت اچھی ہیں۔ تسنیم منٹو کا افسانہ "بند کمروں کی شناسائیاں" بڑے اچھے سوال سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ مصحفی کے شعر کے بجائے اگر اس شعر کے نفسِ مضمون سے کام لیا جاتا تو تسنیم صاحبہ کی تخلیق زیادہ جاندار ہو جاتی۔ اچھا، یار زندہ صحبت باقی۔

تمہارا اپنا۔ محمد علی صدیقی

برادرم اظہر جاوید صاحب!

آپ کا خط پاکر دلی خوشی ہوئی۔ "تخلیق" کا وہ شمارہ مجھے وقت پر مل گیا تھا جس میں آپ نے میرا مضمون "الفاظ آواز اور تصویر" شاملِ اشاعت کیا تھا۔ آپ سچ مچ بہت اچھا پرچہ نکال رہے ہیں۔ بیشتر تخلیقات پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ "اپنی بات" میں بڑے پتے کی بات کہی گئی ہے۔ میں دعاگو ہوں آپ اپنی لڑائی میں سُرخرُو ہو کر نکلیں۔

بھائی کلیم اختر[1] کو آپ نے وہ ویڈیو کیسٹ دے دیا ہوگا جو میں نے آپ کے حوالے کیا تھا لیکن ابھی تک انہوں نے اس کے بارے میں نہیں لکھا۔ پتہ نہیں کیوں انہوں نے میرے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ براہِ کرم اُن سے کہیے وہ مجھے خط لکھیں اور اپنا اپنا پتہ بھیجیں۔

آپ کے ساتھ گزاری ہوئی چند گھڑیاں مجھے کبھی بھولیں گی نہیں۔ آپ کی سادگی، بے ساختگی نے مَن موہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ سے پھر بھی ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں۔ اُمید ہے آپ بمعہ اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں گے۔ میری اہلیہ آپ کو سلام عرض کرتی ہیں۔ ہم دونوں کی طرف سے سب کو آداب۔

سابردت صاحب اپنے حال میں مست ہیں۔ سلام عرض کرتے ہیں۔

آپ کا خیر اندیش۔ وید راہی۔ ممبئی

---

[1] کاش آپ کو ان کے ناگہانی انتقال کی بروقت اطلاع کر سکتا۔ (الف جیم)

بہت پیارے اظہر!

۱۹۹۶ء کا آخری شمارہ ہر لحاظ سے اس درجہ روشن و ریشمی ہے کہ اس کی تعریف بالتفصیل بیان کرنے کے واسطے عمر نوح، صبر ایوب اور حوصلہ یعقوب درکار ہے اور چونکہ فی الوقت ان میں سے ایک بھی نعمت مجھے میسر نہیں اس لئے سر پر ہاتھ اور دل پر پتھر رکھ کر چیدہ چیدہ چیزوں پر ممکن حد تک رائے پیش کر رہا ہوں۔ البتہ اگر مجھے کم سے کم وہ سہولت ہی حاصل ہوتی جس کی بدولت شاعر لوگ لمبی لمبی نظمیں یا مثنویاں بہ آرام کہہ لیتے تھے تو میں یقیناً اس سے مزید طویل مکتوب قلمبند کرتا۔ میرا اشارہ حضرت ساقی کی سمت ہے۔ قلم چلانے سے قبل جسے شاعر حضرات عموماً ہدایت کرتے تھے کہ شراب لاساقی، صراحی لاساقی، پیمانہ لاساقی، برف توڑنے والا سوا لاساقی۔ وہ اس لئے تاکہ طبع رواں ہو اور ہم جس موضوع کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے لگے ہیں اس کی نکسیر بہا سکیں۔

ویسے پیارے اظہر۔ میرے ناخن گرہ کشا سے باوجود ہزار سعی کے یہ عقدہ حل نہیں ہوا کہ شاعر صاحبان ساقی ہی کو صدا کیوں دیتے تھے۔ جیون ساتھی کو کیوں نہیں پکارتے تھے کہ چٹنی لا بھاگوان، چپاتی لا بھگوان وغیرہ وغیرہ۔ خیر رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔ میں تخلیق کے باب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو سب سے پہلے اس حقیقت پر مبارک باد قبول کریں کہ آپ اگر واقعی دل سے چاہیں تو "تخلیق" کو بہت معیاری، یادگار اور خوب صورت بنا سکتے ہیں۔ تازہ شمارے میں کوئی بھی ایسی چیز شامل نہیں کی گئی جس سے متعلق کہا جا سکے کہ وہ بھرتی کی ہے، یہاں تک کہ نیلما سرور کی تصویر بھی اپنی اشاعت کا ٹھوس جواز فراہم کر رہی ہے کیونکہ انہوں نے افسانے کی خاطر ایک منفرد موضوع منتخب کیا اور پھر اس کے ساتھ انصاف بھی پورا پورا کیا۔

حضرت انور سدید نے گزشتہ ماہ غائب رہ کر جو توانائی جمع کی تھی اسے اس مرتبہ متعدد چیزیں لکھنے کے لئے بروئے کار لائے ہیں۔ انہوں نے جو جو شے لکھی ہے وہ قبول صورت اور دلگداز ہے۔ وہ پچھلے کچھ عرصہ سے متواتر ہمیں اپنی بزرگی باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ ان کی تحریریں پڑھ کر حاشیہ قیاس میں ان کی قابل رشک جوانی آئی ہے۔ ان کے یار خاص سید غلام الثقلین نقوی کا مضمون بھی دلآویز ہے۔ وہ میرے گاؤں کے ہیں اور گاؤں جیسا بڑا ناول سپرد قلم کر کے میرے لئے فخر کا باعث بن گئے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

۱۹۹۶ء کے آخری ایام میں جہاں ایک جانب آپ نے معرکۃ الآرا شمارہ شائع کر کے اپنی لیاقتوں کا لوہا منوایا۔ وہاں دوسری سمت ہمارے معروف شاعر حکیم ولی الرحمٰن ناصر نے آناً فاناً شادی کر کے چاروں کھونٹ تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے مجھے ولیمہ میں مدعو کیا تھا حالانکہ توقع مجھے یہ تھی کہ کم از کم اس بار وہ مجھے شادی میں بھی شریک کریں گے۔ بہرکیف میری دلی دعا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی ضرورت سے زیادہ خوشگوار گزرے۔ معلوم نہیں آئندہ ان کے حکمت کدہ پر حسن والوں کا آنا جانا رہے گا کہ نہیں۔ ایک ستارہ شناس سے اس سوال کا جواب جب میں نے مانگا تھا تو اس نے تو روٹھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ اب وہاں کوئی نہیں کوئی جائے گا۔ والسلام

آپ کا عقیدت مند: ضیاء ساجد لاہور

محترم جناب اظہر جاوید صاحب۔

السلام علیکم۔ آپ کے مقدمے پر "انجمن خیال" میں بہت سے تعریفی خط چھپتے ہیں۔ میرا خط قدرے مختلف ہے شاید اسی وجہ سے نہ چھپے[1]۔ مگر تسلی ہے کہ آپ پڑھ تو لیں گے۔ مختصراً عرض کروں گا کہ آپ کا مقدمہ ادیبوں کے ساتھ کوئی مذاق ہی لگتا ہے کیونکہ ادیب تو چھپنے کے لئے ہانپتے پھرتے ہیں اور آپ نے آکر ان کا کھاتہ ہی گول کر دیا ہے۔ ہاں معاشی نقصان شاید ہو لیکن اُن کے لئے نہیں جو محض اپنے لئے لکھتے ہیں۔ ایسے مقدمے تو زندہ معاشروں میں ہی زیب دیتے ہیں اور یہاں کا تو ادب ہی گروہ بندیوں میں جکڑا ہوا ہے جو معاشرے بناتا ہے۔ ان گروہ بندیوں کے باوجود اگر کوئی ادیب چھپ جاتا ہے (پوچھے بتائے بغیر) تو یہ اس کے لئے صلہ سے کم نہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مقدمہ آپ اپنے ساتھ ہونے والی کسی ناانصافی پر لڑ رہے ہوں۔ لگتا تو یہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ادیب عملی طور پر آپ کے ساتھ کیوں نہیں؟ آپ اکیلے کیوں ہیں؟ میرے خیال میں کسی ادیب کا کسی دوسرے ادیب کو چھاپ دینا کوئی بُرائی نہیں، کیونکہ ادب تو چھپنا چاہیئے، پھیلنا چاہیئے۔ مقدموں سے ادب کیا سکڑ نہیں جاتا؟

میں جانتا ہوں میرے اس خط پر کئی ایک ادیب قلم تیز کر کے ٹوٹ پڑیں گے، کیونکہ آج کل ادیبوں میں یہی تو ہو رہا ہے جس کی وضاحت انجمن خیال میں ادارے نے "ایک اور اپنی بات" کے تحت خط میں تفصیل سے کی ہے لیکن جس طرح میرے سوال فطری ہیں جواب بھی فطری ہونا چاہیئے۔

تین مختصر پنجابی نظمیں پیشِ خدمت ہیں۔ میں نہیں جانتا کیسی ہیں ــ خدا سب کی مشکلیں آسان کرے۔

اعجاز روشن (کراچی)

"تخلیق" کے توسط سے جناب جعفر شیرازی کا خط پڑھا۔ مَیں نے تو جعفر شیرازی پر ایک معمولی سا فنّی اعتراض کیا تھا، وہ تو کیل کانٹے سے لیس ہو کر میری شعری واردات، ذات، حالات اور واقعات پر حملہ آور ہو گئے۔ مَیں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں کوئی بہت بڑا شاعر ہوں یا میری شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ویسے اپنی شعری زندگی کی ضمانت تو جعفر شیرازی بھی نہیں دے سکتے اور پھر ہر شاعر زندہ رہنے کے لئے تھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہاں یہ زعم مجھے ضرور ہے کہ میں نے اپنی صوابدید کے مطابق اُردو غزل اور گیت کے لئے ایک علیحدہ کام کیا ہے اور اس کا اظہار برصغیر پاک و ہند کے بہت سارے ناقدین بھی کر چکے ہیں۔ جعفر شیرازی نے لکھا ہے کہ میری غزل میں تغزّل نہیں ہوتا۔ بہتر تھا کہ وہ یہاں غزل کے تغزّل کی وضاحت بھی کر دیتے۔ تغزّل میرؔ کے ہاں بھی ہے اور غالب کے ہاں بھی۔ تغزّل فیض اور فراق کی غزلوں میں بھی اُتم درجے پر ملتا ہے۔ تغزّل سے مرصّع احمد فراز کی غزل بھی ہوتی ہے اور پروین شاکر کی بھی۔ تغزّل ناصر کاظمی اور شہزاد احمد شہزاد کی غزل میں بھی وافر درجے پر موجود ہے۔ تغزّل بشیر بدر اور خورشید رضوی کے ہاں بھی نمایاں ہے۔ تغزّل

---

[1] کس دھڑلے سے لوگ ہماری نیت پر شک کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ (ادارہ)

منیر نیازی اور مجید امجد کی غزلوں کا بھی خاصا ہے۔ مگر ان سب حضرات کی غزلوں میں تغزل کی صورتیں اور مورتیں جُدا جُدا ہیں۔ آخری دو شاعروں نے تو غزل کو نظم کے بہت ہی قریب تر کر دیا۔ ہمارے جدید ترین شعراء میں سے شوکت ہاشمی غزل میں حمد اور نعت کے طلاپ کا جاپ الاپ رہے ہیں۔ غزل ہم نے فارسی ادب سے مہذب کی ہے۔ اس کی بُو باس اور اساس بڑی دیر تک فارسی ادب کی مرہون منت رہی ہے مگر ساتھ ساتھ ہمارے ذہین شعراء نے یہ کرتا اور کشٹ بھی روا رکھا ہے کہ اس میں ہماری اپنی دھرتی کے مزاج اور سراج بھی رواج پا جائیں۔ جب غزل نعت اور نظم کی بزم میں جمال آرا ہو سکتی ہے تو گیت کے وصال میں ڈھلنے سے اسے کیا وبال۔ جعفر صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے ہندی لفظیات کو اپنے اظہار کا نکھار بنایا ہے ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ میں جو لفظ استعمال کرتا ہوں اب وہ ہندی کے نہیں رہے، اُردو کا اثاثہ ہیں کیونکہ مجھ سے پہلے یہی لفظ علامہ آرزو لکھنوی، میراجی، مجید امجد، ابن انشا، قتیل شفائی، قیوم نظر، مختار صدیقی، منیر نیازی اور مجروح سلطان پوری ایسے باکمال شعراء۔ ان سے شعری جمال حاصل کر چکے ہیں۔ اپنی نظم، غزل اور گیت کے حوالہ اور اُجالا سے، صرف میرے یہاں یہ لفظ ایک جگہ یکجا ہو کر آئے ہیں۔ شاید میری سوچ کے کاویے اور زاویے اِن کے قریب تر تھے "پنجابی لفظوں سے میں نے کیوں استفادہ کیا ہے؟" اس لئے کہ میں پنجابی ہوں اور اُردو زبان کا میدان اتنا غیر گنجان نہیں کہ وہ پنجابی زبان کے ساتھ پیمان باندھنے سے ویران ہو جائے جبکہ وہ کئی ایک دوسری زبانوں سے 'نروان' حاصل کر چکا ہے۔ پھر اس کے لئے وہ اشفاق احمد اور اس قبیل کے دوسرے کئی بڑے ادباء اور شعراء سے بھی رجوع کر سکتے ہیں کہ مجھ سے پہلے انہوں نے یہ کام کیوں کیا۔ صرف شیر افضل جعفری کو موردِ الزام ٹھہرانا ٹھیک نہیں، حالانکہ شیر افضل جعفری کی کتاب "سانولے مَن بھانولے" کا دیباچہ بھی مجید امجد نے لکھا ہے اور جعفر شیرازی کی کتاب "ہوا کے رنگ" کا بھی۔ اور دونوں کا تعریفیہ فرق الگ الگ ہے۔ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مَیں اپنے شعر کا خمیر اپنے علاقہ کی جاگیر سے اٹھاتا ہوں۔ میں نے یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ مَیں جاگیردار ہوں۔ اگر میں جاگیردار ہوتا تو اپنا مجموعہ "بن باس" نہ چھپوا لیتا۔ جس کی ضخامت اب سات آٹھ سو صفحات کی جسامت سے بھی زیادہ ہے۔ پنجاب اور پاکستان کے سارے علاقے میری جاگیر میں شامل ہیں۔ انہی علاقوں کی جاگیر میری جنم بھومی ہے۔ میرا سریرا انہی علاقوں کا باسی ہے اور میری آتما انہی کی دیوداسی۔ انہی علاقوں کے ریت، رواج میرے شخصی وقار کے زیور اور میرے شعری اظہار کے تیور ہیں۔ جعفر صاحب کا کہنا ہے کہ میرا پیشہ پیری مریدی ہے" جو درست نہیں ہاں مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ مَیں ایک بہت ہی بڑے "پیر" گھرانے سے متعلق ہوں۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے اجداد میں بڑے بڑے بلند پایہ اور نامور لوگ گزرے ہیں جن سے روحانی ارادت کے 'سلسلے' پنجاب کے پورے پانچ چھ اضلاع کو اپنے احاطہ اثر میں لئے ہوتے ہیں۔ اِدھر میرے جد اعلیٰ حضرت محمد غوث بالا پیر ہیں، جن کے نام پر سوات میں بالاکوٹ آباد ہے وہاں آپ کو بالا پیر عالمگیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نور پور شاہاں والے حضرت امام بری لطیف اور شیر گڑھ والے حضرت سید محمد ابراہیم دادہ بندگی کرمانی نے انہی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ والیٔ ہند سلیم شاہ سوری بن شیر شاہ سوری بھی انہی کا مرید تھا۔ مشہور سورما چاکرِ اعظم بھی انہی کی فیوض و برکات سے سرفراز ہوا۔ چاکرِ اعظم یہاں "سگھرہ" میں دفن ہے اور سگھرہ کے قریب ہی محمد غوث بالا کا مزارِ مقدس ہے جہاں ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو "نوچندی" کا میلہ لگتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں

محمد غوث بالا کے پوتے حضرت داتا شاہ چراغ کا مزار لاہور ہائی کورٹ کی بیک سائڈ پر مغرب کی طرف واقع ہے اور ان کے ارادت مندوں میں شاہجہان بادشاہ کا نام نامی نمایاں ہے (ترکِ دارا شکوہ) داتا شاہ چراغ کی اولاد میں سے حضرت سید سَید محمد ہیں جن کا مزار مبارک یہاں شیخوشریف میں ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا صوبے دار نواب شیخو خان انہی کا مرید تھا اور اسی کے نام پر یہ گاؤں شیخوشریف آباد ہے جہاں میں مقیم ہوں۔ ادھر شیخوشریف میں بھی سال کے اندر دو میلے لگتے ہیں۔ ستمبر اور اپریل میں۔ جنہیں دیکھنے کے لئے دور و نزدیک سے لکھوکھا لوگ آتے ہیں۔ حمد و ثناء اور پند و نصاح کی محافل کے ساتھ ساتھ یہاں پنجاب کی ثقافتی تقریبات کا انعقاد بھی بڑے زوروں اور شوروں پر ہوتا ہے۔ بہت ساری دیگر رسومات کے علاوہ یہاں کلاسیکل اور نیم کلاسیکی موسیقی کی محفل کا برپا کرنا بھی ایک رسم ہے۔ اور ان محافل میں شریک ہونے کے لئے استاد حامد علی خان، امجد امانت علی خاں، اسد امانت علی خان، غلام علی خان، پرویز مہدی، حسین بخش گلو، اللہ دتہ لونے والا، ریشماں، شاہدہ پروین، استاد امیر علی خان اور غلام فرید صابری قوال جیسے نامور فنکار آتے ہیں۔ یہ لوگ میرے خاندان کی نسبت کی بنا پر میرا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ ممکن ہے میری درخواست پر یہ میری کچھ چیزیں گا بھی دیتے مگر میں انہیں بحیثیت شاعر کے کبھی نہیں ملا۔ شاعری نمائش کی چیز نہیں، یہ تو روح کا سادھنا ہے۔ میرا ذریعہ رزق میرا محدود سا رقبہ ہے جسے میں اپنے شراکت داروں کے ہمراہ مسلسل محنت سے کاشت کرتا ہوں اور وہیں سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے رزق حاصل کرتا ہوں اور وہیں کسی سرسبز پگڈنڈی پر بیٹھ کر نیا اور پرانا اردو ادب پڑھتا رہتا ہوں۔ مجھے تو اپنے قریبی دوستوں سے ملے ہوئے بھی سنوں اور سالوں کی کتنی دہائیاں گزر چکی ہیں۔ اس کی گواہی اظہر جاوید کے علاوہ خود جعفر شیرازی بھی دے سکتے ہیں۔ اوپر جو میں نے اپنے خاندان کی تعریف اور توصیف لکھی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ کسی ایسے قبیلہ میں پیدا ہونا کوئی جرم نہیں جس کی روحانی پیشوائی کے سلسلے دور دراز تک پھیلے ہوئے ہوں۔ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم میں اردو اور پنجابی کے بہت سارے ادبا اور شعرا شریک ہیں۔ میں ہمہ وقت ایک شاعر ہوں مگر قدرت نے میرے روزگار کے ذریعے میری مختصر زمین سے وابستہ کر رکھے ہیں جن کی بنا پر میں اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی کٹا رہتا ہوں۔ جعفر شیرازی نے کہا ہے کہ میں نے مجید امجد کا نام لکھ کر اپنا ادبی قد بڑھایا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جعفر شیرازی انہیں ۱۹۳۸ء میں ملے اور میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۷ء میں اُن سے متعارف ہو کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر دیا۔ ۵۷ء سے ۶۴ء تک کا زمانہ میں نے ان کے انتہائی قرب میں گزارا ہے۔ اپنی ذہنی بساط کے مطابق ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کم از کم حرف کے پنڈدل اور بحر کے جھول تول میں ان کی راہنمائی میرے بہت کام آتی ہے۔ مجید امجد سے میری پکی نیاز مندی کی گواہی تو خود جعفر شیرازی بھی دے سکتے ہیں۔ اِدھر میں اُن پر ایک کتاب "ترا مقام کسی اور کو نصیب کہاں" لکھ رہا ہوں ۲۰۰ صفحات لکھے جا چکے ہیں۔ باقی ان سردیوں میں لکھے جائیں گے۔ اُن میں بہت ساری باتیں آجائیں گی، میں جعفر شیرازی سے نادم ہوں کہ انہیں میری وجہ سے تکلیف پہنچی، اور انور سدید کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے اعتراض کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ مجھے پرویز بزمی سے بھی معذرت کرنی ہے کہ میں قاسمی صاحب کا بحیثیت ایک بڑے ادیب کے پہلے بھی احترام کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ وہ تو ایک واقعہ تھا جو روا روی میں میرے قلم سے نکل گیا۔ مجھ پر اشفاق نقوی کا بھی بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے ظفر اقبال ایسے

جید اور جامع شاعر کے ساتھ بریکٹ کیا۔ ظفر اقبال تو ایک ایسا شاعر ہے جس نے پورے ایک دور کو متاثر کیا۔ تازہ "تخلیق" میں اشفاق نقوی نے "نہ" اور "وجہ" کے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں باندھا۔ "نہ" اور "نے" کے فرق کو غالب نے اپنے ایک مصرع میں یوں اُجاگر کیا ہے۔ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" اور کسی دوسرے استاد نے وجہ کو یوں باندھا ہے "وجہِ بے گانگی کسے معلوم"۔

کیول سوری مطمئن رہیں کہ میں نے "تہمت" کا لفظ اپنی غزل سے نکال دیا ہے اور میں راجکپور کی پرانی فلمیں بھی ضرور دیکھا کروں گا۔ اِدھر تخلیق کا اداریہ بڑا شاندار اور جاندار ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے اُردو ادب کے عاشق آپ کی ارادت اور اس سے ملی ہوئی سعادت کی مہک آ رہی ہے۔ غزلیں اب کے ساری کی ساری اعلیٰ درجے کی ہیں اور یہ سب احباب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ نظموں میں وزیر آغا، قتیل شفائی، جیلانی کامران، کیول سوری، رشیدہ عیاں، ناصر کریم اور فرخندہ شمیم نے خیال اور جمال کے رُوپ سروپ کے متعدد گمان اور گیان سے آشنائی بخشی ہے۔ ماہیئے میں شاہدہ ناز نے ماہیئے کے وجود کو اس کی بحر کی درست قیود میں برقرار رکھا ہے۔ افسانے چاروں اعلیٰ اور انوکھے ہیں۔ صرف تسنیم منٹو سے یہ گزارش ہے کہ وہ مصحفی کے اس شعر کی تصحیح کر لیں۔ ؎

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم　　کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

مرحوم رام لعل پر غلام الثقلین نقوی اور انور سدید کے تعزیتی مضمون بڑے بھرپور ہیں۔ مرحوم سے میری بھی دو ایک ملاقاتیں ہوئیں۔ بڑے ذہین اور فطین شخص تھے۔ ؎

سب کہاں، کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

دلیپ سنگھ کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر اور کرشن ادیب نے انتہائی کشادہ اور وسیع ارادہ مضمون لکھے ہیں دونوں مضامین اپنے نثری انداز کا جیتا جاگتا اعجاز ہیں۔ پرویز بزمی نے پنجابی "پھٹک" کا تعارف اپنے پورے فنی مصارف سے کرایا ہے۔ رائے حبیب کی لکھی ہوئی جس 'پھٹک' کو مضمون میں شامل کیا گیا ہے اسے میں نے رائے حبیب کی زبان سے سُن رکھا ہے۔ رائے حبیب بھاٹ اور رائے طالب بھاٹ وقتاً فوقتاً اِدھر میرے گاؤں میں۔ میرے قبیلہ کے بعض افراد کے "جس" کہہ کر لاتے رہتے تھے اور اپنی فنی عظمت کے عوض دان میں ان سے بھینس اور گھوڑے وصول کرتے تھے۔

آخر میں سراج الدین ظفر کا ایک شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

ہم "ساکنانِ قریہ تخلیقِ خوش طریق"　　"تسبیح" زلفِ یارِ شناں روتے رہے۔

برادرم اظہر جاوید کے لئے محبت کے ساتھ۔

ناصر شہزاد

اظہر بھائی!

تسنیم منٹو کی "خدا سی بات" اور "بند کمروں کی شناسائیاں" پڑھ کر بے تحاشا داد دینے کو دل چاہا۔ لطیف جذبات کا نہایت خوب صورت اظہار ہے۔

دلیپ سنگھ سے "تخلیق" کی معرفت تعارف ہوا ہے۔ شگفتہ مزاج سے بھرپور تحریریں تھیں۔ ان کے مجموعے "سارے جہاں کا درد" اور "گوشے میں قفس کے" ڈھونڈنے میں میری مدد کیجئے! ان کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔

شاہدہ لطیف

محترمی!

تسلیم:۔ 1996ء اختتام پذیر ہوا۔ نیا سال طلوع ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سال اپنے ساتھ کیا کیا لایا ہے۔ امن کے جلوس یا قتل و غارت کی آندھیاں۔

"اپنی بات" سے لے کر "انجمن خیال" تک ساری نثر پڑھ لی ہے۔ نظم اور غزل سے بھی مستفیض ہوا ہوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم "ستمبر" سے جنگ عظیم دوم کا حوالہ کتنی خوبصورتی سے ذہن میں تازہ ہوتا ہے۔ جیلانی کامران کی نظم "ماں" نے اپنی مرحومہ ماں کی یاد دلادی۔ یوں ماں بذاتہ ایک گمبھیر علامت بھی تو ہے۔ فرخندہ شمیم کی نظم "اندر کی لڑکی" تو ایک افسانہ ہے جو موزوں الفاظ کی کفایت کا ایک شاہکار ہے۔ اشفاق نقوی اور انور سدید کی غزلوں نے چونکا دیا۔

چاروں افسانے خوب ہیں لیکن جو جدت و ندرت "بند کمرے کی شناسائیوں" میں محسوس ہوئی، وہ "خوب تر" کی ذیل میں آتی ہے۔ مصحفی کا شعر کچھ اور ہی لطف دے رہا ہے۔ یہ شعر اردو غزل کے ان اشعار سے ہے جو مکتب کی تشریح و توضیح کی کاری ضرب نہیں سہ سکتے۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں بھی کلاس روم میں اس غنچہ اندام شعر کی تشریح کے نشتر سے خون ٹپکایا کرتا تھا۔ یہ نہ سوجھا کہ اس کی تشریح افسانے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ تسنیم منٹو نے افسانے کے تار و پود میں اس نازک شعر کو سمو کر اسے امید کی ایک جگمگاتی ہوئی کرن بنا دیا ہے۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے۔

ع چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم

"جرس" کی جیم اور رائے پر زبر ہے۔ یہ لفظ صحیح اعراب سے ادا ہو تو پہلے مصرعے میں وزن قائم رہ سکتا ہے۔

کرشن ادیب کی اپنے یار دلیپ سنگھ کے ساتھ وابستہ یادوں نے جہاں بہت لطف دیا، وہاں مغموم بھی کر دیا۔ یہ مضمون یاد نگاری کا ایک شاہکار ہے۔ پر تاثیر اور رقت انگیز۔ ان کا خط بھی پڑھا۔ وہ اس مضمون کی تکمیل کرتا ہے۔ کاش کرشن ادیب اتنے صحت مند ہوتے کہ اپنی خود نوشت لکھ سکتے۔ یہ اردو ادب کی ایک یادگار اور منفرد تخلیق ہوتی۔ ان ہیلر سے سانسوں کی خیرات لینے میں میں بھی ان کا ساتھی ہوں۔

مخلص۔ غلام الثقلین نقوی

برادرم اظہر جاوید

سلام مسنون۔ ارادے تو اس مرتبہ کچھ اور تھے لیکن اپنی انہتر برس کی "جوانی" دھوکا دے گئی۔ اس پر مجھے ڈاکٹر وزیر آغا یاد آ گئے۔

ایک دن اپنی سابقہ جوانی کی ترنگ میں اپنے کھیت کا "کھال" پھلانگ لگا کر عبور کرنے لگے، پر لے

کنارے کی منڈیر عبور نہ کر سکے اور گر پڑے۔ پاؤں میں موچ آگئی۔ کئی دنوں تک پلستر لگا رہا اور جوانی کو یاد کرنے لگے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" انہیں دنوں لکھی گئی تھی۔ یعنی "کھال" عبور کرتے ہوئے موچ نہ آتی وہ تو عمر رفتہ کو شاید آواز نہ دیتے۔

میں آپ کو "سرپرائز" دینا چاہتا تھا۔ لیکن اب جو کام کرنا تھا وہ عام معمول کی زد میں آگیا ہے۔

دسمبر 96ء کے پرچے میں سب سے روشن مضمون کرشن ادیب نے لکھا ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر دلیپ سنگھ پر رشک آیا کہ اسے دنیا میں کتنا مخلص اور بے لوث دوست نصیب تھا۔ دلیپ سنگھ کی موت کے بعد کرشن ادیب کتنا بجھ گیا ہے۔ اس مضمون کا ایک ایک لفظ سچے خلوص سے مہک رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دلیپ سنگھ نہیں، کرشن ادیب خود مر گیا؟ بھگوان اسے لمبی عمر عطا کرے۔ وہ اردو ادب کا ایک کردار ہے۔ اس وقت مجھے کرشن ادیب پر بلراج کومل کا خاکہ بھی یاد آرہا ہے۔ کومل نے اپنے خاکے میں جو کچھ لکھا تھا اس کی تمام تر صداقت کرشن ادیب کے اس مضمون میں موجود ہے۔ میں نے دلیپ سنگھ پر سلیم اختر کا مضمون بھی پڑھا ہے۔ انہوں نے صرف "فرض کفایہ" ادا کیا ہے۔ وہ اپنی تعزیت میں بھی بالکل سطحی اور سپاٹ نظر آئے ہیں۔ مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ انسان کا باطن خلوص سے عاری ہو تو اس کی تحریریں بھی نامخلص ہو جاتی ہیں۔ تخلیق نے "یاد رفتگاں" کا سلسلہ جاری کر کے اچھا کام کیا ہے۔ موت کی درانتی ادیبوں پر تیزی سے چل رہی ہے۔ کیسے کیسے پیارے لوگ شجر حیات سے کٹتے جا رہے ہیں، ڈاکٹر مقصود زاہدی، جوہر نظامی، اختر الایمان، منظر علی خان منظر، محسن نقوی، اوپندر ناتھ اشک، اشراف حسین احمد، نسیم حجازی، جلیل قدوائی جیسے بے لوث ادیب رخصت ہو گئے۔ باقی کون رہ گئے ہیں، سرکاری کارندوں، افسروں اور وزیروں کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلنے والے۔ ان کے ساتھ اونچی میز پر مہمان خصوصی کی تابع مہمل کرسی حاصل کرنے والے۔ اپنے رسالے میں غزلیں چھپوانے والوں سے تعریفیں سننے، سالگرہ میں منوانے اور کیک منگوانے والے ادیب۔

جو لوگ فرماتے ہیں کہ معاشرے میں ادیب کا مقام بہت بلند ہے وہ سراسر جھوٹ بولتے ہیں۔ اب اس حقیقت میں ایقان پیدا کر لینا چاہئے کہ ادیب کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہے۔ سیاست کی طرح ادب میں بھی "لوٹے" گھوم رہے ہیں۔ جو اپنے معمولی مفادات کے لئے ضمیر فروشی پر اتر آتے ہیں۔

روزنامہ خبریں کے دفتر میں ایک یہ عجیب تجربہ ہوا کہ اخبار کا دفتر تو معاشرے کا آئینہ ہے۔ ادبی معاشرے کی ایسی ایسی خبریں ملک کے ہر کونے سے یہاں پہنچ جاتی ہیں کہ حقیقت کھلنے پر حیرت ہوتی ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں یہی معلوم ہو گیا کہ

راز داں ہوں شہر کی عزت کا میں

میں یہ تمام باتیں الگ رجسٹر میں لکھتا جا رہا ہوں۔ دستاویزی ثبوت جمع کر رہا ہوں۔ لیکن وصیت کر رہا ہوں کہ میری زندگی میں انہیں شائع نہ کیا جائے۔ ان میں بہت سے پردہ نشینوں کے نام اور کرتوت آتے ہیں۔

"تخلیق" کے افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ تسنیم منٹو کا ہے۔ انہوں نے بند کمروں کی شناسائیوں سے نئے پیکر تراشے ہیں اور حقائق کے وہ رخ آشکار کئے ہیں جو صرف ایک افسانہ نگار خاتون ہی دیکھ سکتی ہے اور

مرد افسانہ نگاروں کو نظر نہیں آسکتے۔

میں آپ سے متفق ہوں کہ ہمارے اردگرد اداروں میں' اخباروں میں اور سرکاروں میں ماشاء اللہ ایسے بہت سے ذہین' سمجھدار اور معاملہ فہم لوگ موجود ہیں جو فخر اور ایمان سے کہہ سکتے ہیں۔

"ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت"

لیکن آپ مجھے ڈرے ہوئے انسان نظر آتے ہیں۔ حالانکہ جمہوریت نے ہمیں اب بہت سی آزادیاں دے دی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں بے نظیر کے پورے فلسفہ سیاست سے کبھی متفق نہیں ہوا۔ لیکن جب فخر زمان صاحب ان کا ساتھ چھوڑ کر اکادمی ادبیات سے چمٹ گئے تو مجھے بے نظیر سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انہیں جن پر تکیہ تھا وہی پتے ار حوادث چلانے لگے۔ میں سیاستدانوں کی بات نہیں کرتا۔ ادیبوں کی بات کرتا ہوں اب جو اپنے عمل سے میر جعفر اور میر صادق کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے ادیب ہیں؟ جو اپنے ضمیر کی آواز بھی نہیں سنتے۔ اکادمی ادبیات پاکستان سے بے نظیر بھٹو کی تصویر اتر گئی ہے۔ کبھی آپ اسلام آباد جائیں اور اکادمی میں قدم رنجہ فرمائیں تو بتائیں کہ فخر زمان صاحب نے اب وہاں کس کو لٹکا رکھا ہے؟ اور آج کل ان کی وفاداری کس کے ساتھ ہے۔

آپ کا اداریہ بڑا معنی خیز ہے۔ انگلیاں فگار کرتے رہے خام خوں چکاں رکھئے۔ یہ ناچیز انور سدید آپ کا ساتھ دے گا۔ گالیاں کھا کے کبھی بد مزا نہیں ہو گا۔

میں آخر میں ظفر عظیم صاحب کے ترجمے کی داد دینا چاہتا ہوں۔ جان زیمان کا مضمون ذہن و خیال کے دریچے روشن کرتا ہے۔ سلیم کاشر نے گیت رنگ میں بڑی خوبصورت نظم کہی ہے۔ پرویز بزمی کے مضمون پھٹک (پنجابی ہجو) پر کنول مشتاق کی رائے جاننے کا مشتاق ہوں۔ کیا اس مرتبہ ضیا ساجد کی انجمن میں نمود قلم ہو گی؟

خدا کرے آپ اباخیت ہوں۔

مخلص۔ انور سدید

شریمان صوفی اظہر جاوید

السلام علیکم ..... یہ رہین ستم ہائے روزگار مدتوں کے بعد حاضر خدمت ہے۔ آپ سے سخت ناراض بھی ہوں اور بہت خوش بھی۔ ناراض اس لئے کہ آپ کراچی آتے ہیں اور بغیر درشن دئے چپکے سے واپس چلے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے۔ حسب معمول آپ سے خوش رہنے کا سبب یہ ہے کہ تازہ تازہ تخلیق کی صورت میں آپ کی نوازشات سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور آپ کی 'اپنی بات' پر تو فدا ہو جاتا ہوں۔ "آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی" بے شک آپ کے دامن دل پر کوئی داغ ندامت نہیں۔ خدا کرے آپ سدا ایسے ہی رہیں۔ شاہ سائیں نے کہا ہے "صوفی صاف کیو ذوئی ورق وجو وجو" یعنی جو صوفی ہوتے ہیں وہ اپنے وجود کے ورق کو اشکوں سے یا یوں کیئے کہ خون جگر سے دھو کر صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ کوئی اور مانے یا نہ مانے میں تو آپ کو اپنے دل کی گہرائیوں سے صوفی جانتا اور مانتا ہوں۔ چاہتوں بھرے اظہر جاوید جی بہت جی چاہتا ہے کہ نصف ملاقاتوں کے سوا آپ سے بھرپور ملاقات ہو اور میں اپنا مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش کروں مگر کب اور کیسے؟ بس یہی ہو سکتا ہے کہ میں بھگوان گلی میں آؤں یا کچھ دن کیلئے آپ ادھر آجائیں۔ چلئے فی الوقت آپ اپنے مورچے پر ڈٹے

رہیں اور آپ کا نیاز مند اپنی محنت مزدوری پر قائم و دائم رہے۔
چاہتوں، عنایتوں اور نوازشوں کا دلی شکریہ۔

آپ کا اپنا۔ آفاق صدیقی

مکرمی۔ تسلیمات!

امید ہے مزاج بخیر ہو گے اور اپنے ملک کے حالات سنبھل رہے ہوں گے۔ آپ کو نئے سال کی تہنیت خلوص قلب کے ساتھ پیش کر چکا ہوں۔ اس طرح اپنے بہت سے دوستوں کو سال نو کی مبارک باد کے بھی کارڈ ڈالے لیکن خود اپنے آپ کو مبارک باد اور یہ دعائیں دینے کو بھول گیا کہ خدا ہر بلا ہر پریشانی سے محفوظ رکھے۔ نتیجۃ اخمیازہ بھگت رہا ہوں۔ کہ پانچ جنوری کو صبح تقریباً 11 بجے سینے میں درد اٹھا۔ مجھے اس کی کوئی شناخت نہ تھی کہ یہ حملہ پہلی بار ہوا تھا۔ بستر پر لیٹ کر سینہ کو مسلنے اور دبانے لگا مگر درد تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا نسیم چونکہ عوارض قلب کا شکار ایک عرصہ سے ہے اور پچھلے دنوں سخت بیمار رہیں دو ماہ سے زائد ہسپتال میں رہیں اور کچھ عرصہ Critical Care Unit میں بھی جہاں ایسا وقت آیا کہ خود ڈاکٹران کی زندگی سے مایوس ہو گئے اور نرس سے کہا کہ ان کے عزیزوں کو اطلاع دے دو کہ آکر دیکھ جائیں۔ وہ بھانپ گئیں کہ یہ درد دل اپنی جگہ قائم رہا کس نوعیت کا ہے۔ ہسپتال لے جایا گیا جہاں معمول کے مطابق نوع بہ نوع ٹیسٹ وغیرہ ہوئے۔ دو ایک دن اور ڈاکٹر گھر آیا مگر جمعرات (9 جنوری) کو پھر واپس ہسپتال جہاں مزید تخصیص و تفتیش کی گئی کہ آخر یہ موذی مرض کیسے لگا۔ اب گھر پر ہوں مگر کار چلانا منع ہے۔ آرام تجویز کیا ہے سو کر رہا ہوں آج بیٹھے بیٹھے سوچا کہ خالی وقت میں آپ کو خط ہی کیوں نہ لکھ ہوں ڈالوں کہ خدا جانے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ کم از کم آپ سے باتیں کر کے جی تو بہل جائے گا۔

اظہر۔ یہ دراصل محمود غزنوی کا پہلا حملہ تھا جو سختی سے متنبہ کر گیا کہ اگر مدافعت کے لئے ہر ممکن کوشش نہ کی گئی تو پھر حملہ آور ہوں گا اور ہوتا رہوں گا جب تک۔۔ خیر۔ ان ملکوں میں اخلاقی کمزوریاں اور خرابیاں جتنی بھی ہوں وہ بیان سے کم ہیں مگر حکومت کی پالیسی کے دو اقدام انتہائی قابل قدر اور لائق توصیف ہیں ایک تو یہاں تعلیم 12۔13 گریڈ تک قطعاً مفت ہے حتیٰ کہ اونٹاریو میں تو کتابیں، سکول سپلائیز، اور اسکول کی بس کا کرایہ بھی معاف جو طالب علم کو گھر سے سکول تک لے جاتی ہے اور سکول ختم ہونے پر گھر پہنچا دیتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علاج معالجہ کی سہولتیں امیر کبیر ہو یا مجھ جیسا حقیر فقیر سب کے لئے یکساں ہیں۔ اس ضمن میں مساوات کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو کینیڈا آیئے۔ ہسپتال کا سارا خرچ حکومت کے ذمہ حتیٰ کہ کھانا بھی، باہر سے آپ کوئی غذا مریض کے لئے نہیں لے جا سکتے یہ غیر قانونی ہے کہ کھانے کی فہرست Dietician ہر مریض کے لئے تیار کرتی ہے۔ دوائیں، سارے ٹیسٹ اور نگہداری سب مفت، مریض اس وجہ سے ہسپتال جانے سے گریز نہیں کر سکتا کہ اخراجات کہاں سے بھروں گا، اس کے بر خلاف ہمارے ملک میں کتنے غریب مساکین مختلف النوع بیماریوں میں مبتلا ہو کر بغیر کسی علاج معالجے کے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں ہم ان کے وسائل اور ذرائع علاج کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر انصاری، قابل اجمیری محسن بھوپالی محسن احسان وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

میں اپنے اس خط کے ہمراہ رام لعل کا ایک خط بھی روانہ کر رہا ہوں اگر آپ اس خط کو انجمن میں جگہ دیں تو براہ کرم اس خط کو بھی میرے ہی خط کے ساتھ چھاپ دیں۔ اس سے پتہ چلے گا کہ اس پایہ اور عظمت کا

افسانہ نگار جب گردے کے کینسر میں مبتلا ہوا تو اس کے پاس دوا دارو' علاج معالجہ کے لئے اسباب مہیا نہ تھے۔ اس کو ھومیو پیتھی اور بعد میں آیورووید ک کا سہارا لینا پڑا۔ مگر بات کچھ بنی نہیں آخر کار بھگوان کو پیارا ہوا میرے اس خط کے ذریعے سے تخلیق کے بہت سے قارئین جو خصوصیت سے ضیا نواز ہیں مثلاً۔ صغیر ادیب نعیمہ ضیاالدین' خالد بزمی' شاہین بدر اور بہتیرے جو میری تخلیق سے مستقلاً غیر حاضری پر مشوش ہیں وہ یہ جان جائیں کہ یہ امر نہ دانستہ تھا نہ شعوری بلکہ بدرجہ مجبوری۔ بہن حمید معین رضوی کو میرا پتہ درکار تھا یہاں لکھے دیتا ہوں۔

961AUGER.AVE.SUDBURY-ONTARIO'P3A'4A7

اب اجازت چاہتا ہوں۔

بیماری کی وجہ سے خط تحریر خط شکست بن گیا ہے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کی سب کی دعاؤں کا طالب۔ عبدالقوی ضیا (امریکہ)

پیارے اظہر جاوید:

"تخلیق" میں آپ کی تلخی برابر بڑھتی نظر آتی ہے مگر جوش محبت بھی تو اسی حساب سے بڑھنا چاہئے۔ تخلیق کاروں کی "تلخی" نے جہاں میں ہمیشہ ادب و محبت کو بڑھاوا دیا ہے۔ اجازت چاہتا ہوں۔

محبت و ارادت کے ساتھ۔

مخلص۔ کاوش عباسی (سعودیہ)

پیارے تخلیق جاوید' نیا القاب اور سال نو کی مبارک باد قبول فرمائے'

تخلیق کا دوسرا نام اظہر جاوید ہے اور اظہر جاوید سرتاپا تخلیق ہے۔ اللہ دونوں پر دائم کرم فرمائی کرے آمین۔

اظہر بھائی' یہ انجمن خیال میں ہجرت' خدا' اللہ اور کئی الفاظ جو صدیوں سے رائج ہیں۔ ان پر کیا بحث مباحثہ شروع کر دیا گیا ہے۔ میں نے جب جی صاحب میں تمثیل پڑھی تھی کہ خداوند کریم کو کسی بھی زبان میں یاد کیا جائے۔ وہ سب زبانیں جانتا ہے۔ ایک ہرنی شکاری کی زد میں تھی جس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا۔ ہرنی کو گھیرے میں رکھنے کیلئے ایک طرف آگ جل رہی تھی دوسری طرف جال تنا ہوا تھا۔ تیسری طرف خوفناک شکاری کتا کھڑا تھا اور اس کے ساتھ شکاری تیر کمان لئے موقع کا منتظر تھا ہرنی بے بسی کے عالم میں تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جال کو آگ لگا گئی۔ آگ لگتے ہی وہاں سے ایک سانپ نکل بھاگا اور شکاری کو ڈس لیا۔ لہٰذا شکاری کے ہاتھ سے بے ساختہ تیر چھوٹا اور کتے کو لگا۔ کتا وہیں دم توڑ گیا۔ ہرنی آزاد ہوگئی۔ اب آپ ہی بتائے کہ ہرنی کون سی زبان جانتی تھی۔ وہ نہ تو عربی جانتی تھی نہ فارسی نہ ہندی نہ سنسکرت لیکن اوپر والا سب بے زبانوں کی زبانیں بھی جانتا ہے۔ اس قسم کے لفظوں کی بحث مباحثے کو ختم ہونا چاہئے۔ ہمیں اردو زبان سے محبت ہے اور یہ زبان وسیع القلب ہے۔ اس میں دنیا بھر کے الفاظ جذب ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم جو پنجاب زبان بولتے ہیں اس کا بھی ہر تیسرا لفظ اردو بلکہ فارسی عربی کا ہے۔ کبھی چند لمحے تنہا بیٹھ کر روز مرہ کی پنجابی گفتگو کے الفاظ پر غور کرنا۔

خیر یہ خشک موضوع میرے مزاج کے منافی ہے۔ اب سنو، تخلیق کے تازہ شمارے کا اس لئے شدید انتظار تھا کہ میں "یادیں باتیں یار دلیپ سنگھ کی" کو زینت تخلیق دیکھنا چاہتا تھا۔

اظہر بھائی۔ آج لکھتے لکھاتے، چھپتے چھپاتے تقریباً چالیس بیالیس سال ہوگئے ہوں گے۔ لیکن کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس مضمون کو پکی روشنائی میں چھپے دیکھ کر ہوئی۔ پیارے اظہر، یہ سب تیرا حسن کرشمہ ساز ہے اور وہ محبت ہے جو میرے لئے آپ کے دل میں ہے۔ اس طویل مضمون کو آپ نے شائع کر کے ادب کے تذکرہ میں محفوظ کر لیا۔ شکریہ!

حصہ نظم میں، قتیل شفائی کی دونو نظمیں اور محترمی وزیر آغا صاحب کی نظم ستمبر بہت پیاری تخلیقات ہیں جو ایک سے زیادہ بار پڑھنے پر خود کو مجبور کرتی ہیں۔ سچ پوچھو تو حصہ نظم میں ایک بھی نظم کمزور نہیں ہے۔ جیلانی کامران، عین سلام، نوید عرشی بخاری، ناصر کریم کی نظمیں بھی خوب تر ہیں۔ لیکن کیول سوری کی نظم عشق و خرد کے درمیان پڑھ کر کیول سوری سے عشق ہو گیا ہے۔ یار اظہر، میں نے کیوں سوری کی نظم بھی پڑھی ہے اور نثر بھی۔ خدا گواہ ہمیشہ نشاط آمیز لطف کا احساس ہوا ہے۔

سات سمندر پار کی شاعرہ رشیدہ عیاں جو کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ان کی نظم اور فرخندہ شمیم کی اندر کی لڑکی تخلیق کی طرف سے اپنے قارئین کو خوشگوار تحفہ ہیں۔ اللہ ان سے اور بہترین نظمیں لکھوائے۔ بھائی میرے، اب ہم سے تو کچھ لکھا نہیں جاتا۔ خود کو دہرانا واہیات ہے۔ آپ کی کیول سوری یا دوسری جن نظموں کی میں نے توصیف و تعریف کی ہے۔ سب کی سب میری ہیں۔ میری آتما کی آواز ہیں۔ مجھے جب کہنا ہو گا سب سے ہٹ کر کہوں گا۔

کل کہیں سے ادب لطیف کا گولڈن جوبلی نمبر مل گیا۔ اس میں آپ کی نظم "بے انجام کہانی" پڑھی۔ تادیر فسردہ رہا۔ جیسے یہ واقعی میری نظم ہے اسے میں نے کہا ہے۔ شاید میں ان دنوں اس نظم کے ماحول سے گزر رہا ہوں۔ کب یہ خبر آجائے کہ "کرشن ادیب نہیں رہا" اس خبر کا ردعمل پڑھنے والوں یا والیوں پر کیا ہو، خدا بہتر جانتا ہے فی الحال اس نظم میں اتنا شدید اثر ہے کہ میں اپنی روح میں جھانک رہا ہوں کہ شاید پتہ چلے کہ

وہ کون اس کی سوچوں کی رانی رہی تھی
بے انجام کیوں یہ کہانی رہی تھی!

رام لعل بھی گئے۔ ان کی یاد میں غلام الثقلین نقوی، انور سدید کے مضامین پڑھے۔ بہت اچھے لگے لیکن احساس تشنگی رہا۔ بہت مختصر لکھا گیا۔ کاش میں رام لعل کے بارے میں کچھ لکھ سکتا لیکن میرے پاس وہ تنقیدی شعور نہیں جو زریں فن پاروں کو کالی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ رام لعل ایک معتبر افسانہ اور بہترین دوست تھا۔ حالانکہ ہماری بمشکل تمام دو چار ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور پانچ چار خطوط کا تبادلہ ہوا ہو گا۔ رام لعل نے ایک مرتبہ اپنا Bio-data بھجوایا تھا۔ میرے بعد اسے کون دیکھے گا۔ لہٰذا آپ کو بھیج رہا ہوں۔ کبھی کبھار کام آجائے گا۔ تخلیق کے لئے۔

حسن اتفاق سے Bio-data کے ساتھ رام لعل کا ایک معلوماتی خط بھی مل گیا یہ بھی رام لعل کے کسی کونے میں محفوظ کر لیں۔

میں برادرم انور سدید سے گزارش کروں گا کہ وہ رام لعل کے افسانے پر ایک طویل' بھرپور مضمون سپرد قلم کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک کسی نے رام لعل کی فنی قامت کے مطابق کوئی مضمون نہیں لکھا !

میرے ذہن پر تو ابھی تک دلیپ سنگھ کے غم کی دھند چھائی ہوئی ہے اس نے میرا خاکہ "قلندر" قدرے اضافے کے ساتھ دوبارہ لکھا تھا۔ اب میں مزید اس سے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ شاید بلراج کومل بھی لکھے!

کل بلراج کومل کا خط آیا تھا اس نے تخلیق میں شائع شدہ میرے مضمون کو بہت پسند کیا۔ شاید وہ 27 جنوری کو ادھر ہوشیار پور میں فراق سیمینار کے سلسلے میں آئے تو لدھیانہ بھی آئے گا۔ پھر تادیر باتیں ہوں گی۔

میں نئے سال کا کارڈ جو کہ میں نے فوٹو گراف تیار کیا ہے بھیج رہا ہوں۔ یقیناً پسند آئے گا۔ اسے آپ تخلیق کا سرورق بھی بنا سکتے ہیں۔

اظہر بھائی کیا آپ نے خط نہ لکھنے کی قسم کھائی ہوتی ہے۔ خط لکھیے۔ حمید اختر واپس پاکستان آ گیا ہے کہ نہیں مطلع کریں۔ میرے بھائی جان قتیل کی صحت سے متعلق لکھیں۔ آپ کا شائع شدہ خط بہ صورت تخلیق تو باقاعدگی سے مل جاتا ہے۔ انجمن خیال بزم یاراں ہوتی ہے۔ تادیر لطف اٹھاتا ہوں لیکن آپ کا تحریر کردہ ذاتی خط بھی ملنا ضروری ہے۔

میری یادداشت ساتھ نہیں دیتی تاہم اگر پہلے یہ نظم نہیں ارسال کی تو پسند آئے تو شائع کر دینا۔ وگرنہ رد کر دینا۔ یہ پرانی نظم اچانک دستیاب ہوئی ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔ اور بہت سی باتیں اگلے خط میں۔

آپ کا اپنا۔ کرشن ادیب

اظہر بھائی۔ خط ختم کر چکا تھا لیکن تخلیق ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ابھی ابھی محترمہ نیلما سرور کی بے حد اچھی کہانی آسمان سے زمین پر پڑھنے کو ملی' حیرت ہے کہ ان دنوں خواتین افسانہ نگار اور شاعری دونوں اصناف پر چھائی ہوئی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر تخلیق پڑھنے کو ملتی ہے۔ شاید وہ مردوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتی ہیں اور اس لئے ان کی تخلیقات میں جذبے کی شدت ہوتی ہے۔ بہرحال آفرین باد۔

ادیب

برادر عزیز

تسلیمات' تخلیق باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ جس کے لئے میں دل کی اتھاہ گرائیوں سے ممنون ہوں.... دسمبر کا شمارہ بھی حسب روایت بعض نہایت عمدہ معیاری اور متاثر کن تخلیقات سے مزین ہے۔ جن کے مطالعے سے آپ کا حس ادارت آشکار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے وسائل اور فکری صلاحیتوں کو اور زیادہ جلا بخشے۔ آمین۔

برادرم! آپ کی ادبی و صحافتی زندگی۔۔۔ بلکہ ذاتی زندگی بھی ہم ایسوں کے لئے بجا طور پر وجہ افتخار

ہے کہ آپ نے ہمیشہ علم و فن اور ادب و ثقافت کے فروغ کے لئے اخلاص و ایثار کا اظہار کرتے ہوئے۔ حق دار کو ہی رسید دی ہے جو اخلاقی انحطاط اور ادبی و صحافتی گرانی و بحرانی کے اس دور میں بجا طور پر ایک روشن و عمدہ مثال ہے اب تو شاید چراغ رخ زیبا لے کر بھی تلاش کرنے سے یہ کہیں نہ ملے۔ تخلیق نے جس طرح ہمیشہ ہی نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا ہے اور جس انداز سے نیا ٹیلنٹ ادبی دنیا کو دیا ہے وہ ادبی تاریخ کا ایک روشن اور مستند باب ہے جس کے بارے میں حال ہی میں خامہ بگوش جیسے بے رحم نقاد نے بھی بہت مثبت انداز سے اظہار خیال کیا ہے یہ سب کچھ بہت "دل جگڑے" کا کام ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مزید حوصلہ اور وسائل عطا فرمائے۔

پرچے کے Contents کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پیشتر تازہ شمارے میں آپ کی طرف سے اس حق کے استعمال کی دھمکی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جس کا اظہار آپ نے گوشہ خیال کے آغاز میں کیا ہے۔۔۔ یقیناً یہ آپ کا ادارتی حق ہے جس کے استعمال سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ مگر اس کے باوجود میری گزارش ہے کہ خدارا ایسا نہ کیجئے گا۔ کیونکہ گوشۂ خیال میں سب کچھ کہہ اور چھپ جانے کی آزادی و روایت کی وجہ سے بہت سے احباب از خود، بلکہ بقلم خود Expose ہو رہے ہیں اور ان کے اندر کی خباثت و آلودگی (بصد معذرت) اتنی واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی دوسرے کو اس پر رائے زنی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

بشریٰ اعجاز کا سفر نامہ بہت خوب ہے شاعری کے بعد نثر میں بھی متاثر کر رہی ہیں۔ شفیع عقیل کے بارے میں خصوصی گوشہ اور رفتگاں کے زیر عنوان رام لعل و دلیپ سنگھ کے بارے میں بہت عمدہ تحریریں ایک جگہ پڑھنے کو ملیں یقیناً یہی آپ کا حسن ادارت ہے۔ پرویز بزمی کے سلسلے بھی خوب اور بہت معلوماتی ہیں تاہم پنجاب رنگ میں حسین شاہد کا "گون" بلکہ صرف ایک مصرعہ ہی

اسیں جمدے رہے مرن لئی ساڈے دکھ نبیڑے موت

بہت سی تحریروں پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں لمبی زندگی دے۔

عزیزان کنول مشتاق اور ضیاء ساجد کو اب اپنی عمر دیکھ کر سنجیدہ ہو جانا چاہئے بے معنی تحریریں اور الٹے سیدھے بے مقصد خطوط انہیں تخلیق کی بجائے کسی اور (قہقہہ چاند ٹائپ رسائل) میں لکھ کر اپنا شوق پورا کرنا چاہئے۔

اور ہاں ستار طاہر کے فٹ نوٹس بہت عمدہ سلسلہ تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ کیا اکابرین ادب میں سے کوئی اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھا سکتا؟

تخلیق اور آپ کے لئے بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔

افتخار مجاز

جناب اظہر جاوید۔۔۔ آداب

پہلی بار "تخلیق" صدر کراچی کے بک اسٹال پر نظر آیا تو خرید لیا۔ اس سے پہلے آپ کے رسالے کا کوئی شمارہ نظر سے نہیں گزرا کہ صدر یا اردو بازار کراچی میں کہیں بھی دستیاب نہیں تھا۔

"انجمن خیال" میں بڑے ہنگامہ خیز اور پر مغز دونوں طرح کے خطوط پڑھنے کو ملے۔ اس سلسلے میں

آپ کی تمہید۔۔۔ "ایک اور اپنی بات" سے ہر کوئی اتفاق کرے گا۔ یقیناً یہ آپ کی وسیع النظری اور کشادہ دلی ہی کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے اب تک ایسے خطوط بھی شائع کیئے جن میں دوسروں کے بارے میں تلخ گوئی کا زہر اگلا گیا' دل آزادی کے تیر برسائے گئے اور بے رحمانہ طنزیہ و تمسخرانہ اسلوب اختیار کر کے آپ کی "جمہوری پالیسی" کو غلط انداز میں استعمال کیا گیا۔ آئندہ کے لئے ایسے نازیبا خطوط کی عدم اشاعت کا اپنا حق استعمال کرنے کا بروقت نہ سہی تاخیر سے ہی پیش بندی کا عندیہ دے کر' خواہ مخواہ سخت لفظوں میں دل کی بھڑاس نکالنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے! آخر ادیب و دانشور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال کر اپنے کردار کے منفی گوشوں کو ظاہر کر کے کیا تسکین پاتے ہیں! ایک دوسرے کے بارے میں زبان پر تلخی اور دل میں چھپے میل کو نوک قلم کے سہارے دوسروں تک پہنچا کر کون سا ادبی کارنامہ سرانجام دیتے ہیں!!

ادیب' شاعر' نقاد' محقق' دانشور .... ہر ایک اپنی اپنی قابلیت اور ذہنی اڑان کے طفیل شعر' نثر' تنقید وغیرہ لکھتا ہے تو یوں وہ "دربار ادب" میں باریابی پانے کی کوشش کرتا ہے' اگر اس کی تحریر میں جان ہوگی تو کسی کی منفی تنقید یا گالی گلوچ اور بدنامی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اگر ادبی دائرے میں رہ کر' مہذب انداز میں تنقید کی جائے' غلطیاں اور کوتاہیاں نشان زد کی جائیں اور کمزوریوں پر انگلی رکھی جائے تو میرے خیال میں یہ ادب کی خدمت ہوگی لیکن دل کے جلے پھپھولے توڑنے کیلئے لفظوں میں دل آزاری کے چھینٹے اڑائے جائیں تو صاحب تحریر کی ذہنیت پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

دسمبر 1996ء کے شمارے میں ماہیے (شاہدہ ناز) کے علاوہ' اندر کی لڑکی (فرخندہ شمیم) اور خواہش (سلیم عباس قیصر) اچھی نظمیں ہیں۔ افسانوں میں جنازہ (وید راہی) بیانیہ اور سیدھے سادے انداز میں معاشرے پر گہرے طنز کا حامل افسانہ ہے۔ واقعی اس زمانے میں ایماندار' بے لوث اور کھرے شخص کی قدر نہیں ہوتی۔ دھوکہ' فریب' ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے والوں کی لوگ پوجا کرتے ہیں' ان سے ڈرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے روسی صدر یلسن کے بارے میں خوب تجزیہ کیا ہے۔ لیکن یلسن سے بڑا مجرم سابق صدر گورباچوف' امریکہ کا سب سے بڑا ایجنٹ تھا۔ جس نے روس جیسی بڑی طاقت کو ملیامیٹ کر کے دنیا کے کمزور ملکوں کو امریکہ جیسی سفاک اور بے رحم سپر پاور کے حوالے کر کے کرہ ارض پر فوجی توازن بگاڑ دیا۔

مزاج پرسی کرنا.... (مجتبیٰ حسین) اچھا طنزیہ و مزاحیہ مضمون ہے۔ رفتگاں کے ذیل میں "یادیں باتیں ..... یار دلیپ سنگھ کی" (کرشن ادیب) بہت ہی اچھا مضمون ہے۔ جس میں دلیپ سنگھ کے ساتھ ساتھ کرشن ادیب نے اپنی شخصیت کی پرتیں بڑی صفائی سے اتار کر قاری کو اپنے اندر جھانکنے کا موقع دیا ہے اور یہ ان کی کشادہ دلی ہی کہی جاسکتی ہے۔ غزلوں کا حصہ بھرپور ہے اور کچھ اشعار تو کافی اچھے ہیں۔

عبدالقیوم

برادر محترم'

آداب و سلام....

طالب خیریت باخیریت میں نے آپ کو خط لکھا تھا جس کے جواب کا خواہشمند تھا۔ مگر جواب اب تک

نہیں آیا۔ شاید آپ زیادہ مصروف ہیں؟ میں نے لکھا تھا کہ میری آئندہ آنے والی کتابیں آپ کی توجہ چاہتی ہیں۔ آپ انہیں ادارۂ تخلیق کی طرف سے شائع کرنے کا اہتمام کریں۔ یا الحمد پبلشرز سے بات کر کے مجھے لکھیں۔ ویسے میری خواہش ہے کہ آپ خود ہی شائع کریں تو بہتر ہو گا۔ جواب کا منتظر ہوں۔

ایک زحمت اور ۰۰۰۰ ڈاکٹر انور سدید صاحب کا فون نمبر مجھے درکار ہے۔ یہ بھی تکلیف کر کے مجھے لکھئے ممنون ہوں گا۔

احباب کو سلام۔

مخلص۔ افضل منہاس
(۲ر جنوری ۱۹۹۷ء)

جناب اظہر جاوید صاحب
السلام علیکم!

میرے والد افضل منہاس 15 جنوری کو وفات پا گئے ہیں اس لئے آپ کو اطلاع کر دی ہے۔

آپ کی دعاؤں اور راہنمائی کا طالب
منیر حسین ولد افضل منہاس

انا للہ وانا الیہ راجعون
ہمیں جیتے جی نہ جانے کتنے دوستوں، ساتھیوں اور اپنوں کا غم سہنا پڑے گا۔

(ادارہ)

جناب اظہر جاوید صاحب
آداب،

گرامی نامہ، نظم اور تخلیق، باصرہ نواز ہوئے ..... اول الذکر دو پر نہایت مسرت ہوئی ..... اور آخر الذکر .... گویا ہماری چھٹی کرنے ہی کا انتظار تھا پرچے کا گٹ اپ، ضخامت، کتابت، سب کچھ دیدہ زیب اور متاثر کن تھا اوپر سے ضخیم اور عمدہ مواد بھی شامل کر دیا آپ نے۔ کرشن ادیب کا مضمون رسالے کی جان تھا.... اتنی عمدہ نثر .... ادب میں ایک عرصہ بعد مطالعہ کو ملی.... کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور راجہ مہدی علی خان کے نثرپارے یاد آ گئے باقی تحریریں بھی اچھی تھیں۔

میں نے گزارش کی تھی کہ فخر زماں سے کیا معاملہ رہا۔ کاغذی کارروائی کے علاوہ..... کوئی زبانی یا کسی کے توسط سے صلح جوئی کی نوبت نہیں بن پائی....؟ تو آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ آپ کی پرانی انڈیا یاترا کا کچھ کچھ حال تو بشریٰ اعجاز سنا ہی رہی ہیں۔ تازہ صورت حال اگر کہیں اردو میں طبع ہو تو فوٹو کاپی سے ضرور نوازیئے گا۔

نعیمہ ضیاالدین، جرمنی

محترم اظہر جاوید صاحب

اسلام و علیکم.... امید ہے مع الخیر ہوں گے تازہ شمارہ ملا "اپنی بات" ہمیشہ کی طرح کاٹ دار ہے۔ نظموں کا حصہ بھی خاصا جان دار ہے جیلانی کامران، کیول سوری، ناصر کریم اور سلیم عباس قیصر کی نظمیں خوب ہیں۔ غزلوں میں انور شعور، صبیحہ صبا، عمر زمان، جون ایلیا، رضی الدین رضی نے بھی اچھی غزلیں کہی ہیں اس مرتبہ شفیع عقیل صاحب کا گوشہ خاصہ معلوماتی ہے یہ کام آپ نے اچھا شروع کیا ہے۔ احمد راہی صاحب سلیم کاشر، حسین شاہد، اعزاز احمد آذر، زاہد صدیقی نے پنجاب رنگ میں اچھے رنگ بھرے ہیں، البتہ بشریٰ اعجاز صاحبہ کے سفرنامے میں ایک درستگی جو کہ غلط العام ہوئی ہوئی ہے۔ ضروری نہیں۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں "مورت اندر صورت" کے عنوان سے بابا غلام فرید کے حوالے سے جو مصرے لکھے ہیں وہ مصرے دراصل مظہر ترمذی کے ہیں جو ان کے مجموعے "ٹھنڈی چھاں" میں "گاون" کے نام سے چھپے بھی ہیں (فوٹو کاپی لف ہے) براہ کرم ریکارڈ کی درستگی کیلئے اسے یعنی گاؤن کو ضرور چھاپ دیں تاکہ مزید قارئین بھی اس سے مستفید ہو سکیں امید ہے مجھے اس گستاخی پر معاف فرما دیں گے۔ باقی سب خیریت ہے۔

آپ کا اپنا، سلیم شہزاد

گاون

ہے نہ کِس دے کایا !
تراں تکھیاں پیاں بہار
کرے نہ کو سنیہا گھلیا
پھلاں دے رنگ کالے
تیرے گلاں دے موسم وچ پھلاں نے رنگ کالے
زلفے زلفے
رت دے شور وپاواں اندر
اوس نہ لتے گھگے
اندر اندر وگدا رہندا پانی درد جیانی دا
سانواں تراں زن دی ودی عمر اے تیری
ہے نہ کِس دے کایا !

برادرم اظہر جاوید

السلام علیکم.... تخلیق میں شاید پہلی بار "اپنی بات" کے علاوہ دوسرا اداریہ بھی شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آپ جیسے باحوصلہ شخص کی قوت برداشت بھی ادیبوں کی غیر ذمہ دارانہ روش اور ناشائستہ تحریروں کی وجہ سے جواب دے چکی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ادیبوں کا اگر یہی انداز رہا تو آپ کو مجبوراً یا تو مدیرانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے غیر اخلاقی جملے حذف کرنا پڑیں گے یا "انجمن خیال" کا سلسلہ ہی بند کرنا پڑے گا۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ تقریباً نصف صدی ادیبوں کے ساتھ گزارنے کے باوجود ابھی تک اپنی برادری کی ذہنیت کو نہیں سمجھ سکے۔ ہم لوگ اپنی ذات کو اجاگر کرنا اور دوسروں کی کردار کشی کرنا اپنا

حق سمجھتے ہیں۔ اور ایسا کرتے وقت ہم کسی قسم کی اخلاقی قدروں کی پرواہ نہیں کرتے۔ جن لوگوں کے خلاف ہمارے دل میں ذرا سا بھی بغض ہو انہیں موقع بے موقع رگید نا ہم اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ انہیں کرتوتوں کی وجہ سے اہل قلم برادری کی اکثریت بے توقیر ہو چکی ہے اور لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادیبوں کا کیا ہے۔ محض ایک پیالی چائے پلا کر ان سے جو چاہو لکھوا لو۔ گویا ہماری قیمت صرف ایک پیالی چائے ہے۔

"انجمن خیال" ایک قسم کا کاغذی ہائیڈ پارک ہے جس میں ادیب ہر قسم کی بات کھل کر بیان کرتے ہیں اور آپ انہیں من و عن شائع کر دیتے ہیں۔ اور چڑیا سے بھی چھوٹا دل رکھنے والے اکثر ادیب اور بڑے بڑے دانشور خلاف طبع کوئی جملہ پڑھ کر ذمہ داری آپ پر ڈال دیتے ہیں اور ان کے غصے کا نزلہ آپ پر گرتا ہے۔ اگر آپ انجمن خیال کا سلسلہ بند کر دیں گے تو کیا اس طرح آپ سے ناراض لوگ آپ سے اپنی دشمنیاں ختم کر دیں گے؟

ایک دفعہ غلام ربانی تاباں نے ایک خاص نکتہ نظر کے حامل شعرا کا شعری انتخاب "شکست زنداں" کے نام سے شائع کیا تھا۔ پارٹی گائیڈ لائن کے تحت لکھی گئی ان تحریروں کی سطحی غوغا آرائی اور نعرہ بازی سے کڑھ کر جوش ملیح آبادی نے اس پر ایک منظوم تبصرہ کیا تھا۔ جس کا پہلا اور آخری شعر درج ذیل ہیں۔

"آہ دل کو "شکست زنداں" نے
کر دیا نسل تازہ سے مایوس
آفرین بر غلام ربانی
کیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس"

"انجمن خیال" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دانشوروں کے اصل چہرے سامنے آتے ہیں۔ یعنی دانشوروں کی دانش کا جلوس نکلتا ہے۔ میں جوش صاحب کی طرح مینڈکوں کا جلوس کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ دانشوروں کا یہ جلوس نکلتا رہنا چاہئے۔ اس سلسلے کو بند نہ کریں۔ تخلیق کے قارئین کو اس جلوس کی رنگا رنگی سے حظ اٹھانے دیں۔ ہو سکتا ہے کسی دن ہم لوگوں کے مردہ ضمیر میں ذمہ داری اور شائستگی کی کوئی رمق پیدا ہو جائے۔

سید جعفر شیرازی نے ایک اور سید ناصر شہزاد صاحب کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں آنحضور صلعم سے نسبت ہونے کی وجہ سے سادات کا بے حد احترام ہے۔ لیکن سید جعفر شیرازی صاحب کا خط پڑھ کر پنجابی کی ایک کہاوت یاد آتی ہے۔

"اوہ ہور سید اہہ ہور سید....."

جعفر شیرازی صاحب نے ناصر شہزاد صاحب کی تخلیق کے سابقہ شمارہ میں شائع ہونے والی ایک غزل کا مذاق اڑاتے ہوئے قافیہ کی آڑ میں انہیں "لفنگا، تلنگا اور پنگا" لینے والا تک کہہ ڈالا ہے۔ شاید ایسی ہی تحریریں تخلیق کے دوسرے اداریہ کا باعث بنی ہیں۔ میں تو آپ سے گزارش کروں گا کہ مدیرانہ اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس قسم کے جملے بھی حذف نہ کریں۔ ہم دانشوروں کو اور ننگا ہونے دیں۔ جب جعفر شیرازی صاحب کی ننگی گالیاں شائع ہو سکتی ہیں تو پھر کاٹنے کو باقی کیا رہ جاتا ہے۔

میرے پنجابی مضمون "پھٹک" کی پہلی قسط شائع فرمانے کا شکریہ۔ اس دفعہ کنول مشتاق صاحب انجمن خیال میں نظر نہیں آئے۔

نیاز مند... پرویز بزمی

محترم جناب اظہر جاوید صاحب

آداب!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کی محنت کا ثمر تخلیق شمارہ دسمبر 1996ء موصول ہوا اور کبھی کبھی تخلیق کو پڑھ کر اور اس کے حسن و دلکشی کو دیکھ کر آپ کی محنتوں محبتوں کا رنگ دیکھ کر میرے دل میں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ آپ سے پوچھوں کہ "آپ اتنا کام کیوں کرتے ہیں اس کار زیاں سے آپ کو کیا ملا ہے.....؟ محترم اظہر جی اس شمارہ تخلیق میں یوں تو بے شمار الماس و جواہر ریزے بھرے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان آپ نے کوہ نور ہیرے جیسی شخصیت شفیع عقیل کا خصوصی مطالعہ پر مبنی گوشتہ پیش کر کے ایک کمال کیا ہے۔ شفیع عقیل حقیقتاً ایسے شاعر ہیں۔ جو ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا کے اصولوں کے تحت عمر بھر ادب کی خدمت کرتے رہے اور آج تک کسی نقاد کسی اہل قلم نے ان کی تخلیقات کا جائزہ یا مطالعہ پیش نہیں کیا میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بہت ساری گروہی وجوہات تھیں اور ہیں افسوس جہاں یہ دنیا ایک آنگن میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ وہاں ہمارے دانشوروں کے اذہان "گروہوں" اور مفاد پرستوں میں مقید ہوتے جا رہے ہیں اور ایک شکوہ یہ بھی ہے کہ آپ نے شفیع عقیل کی پنجابی شاعری کم شائع کی آئندہ کسی شمارے میں شفیع صاحب کا ڈھیر سارا پنجابی کلام ضرور شائع کیجئے گا "رب تہاڈی عمر ودھاوے"

شمارے کے دوسرے حصوں کی بات تو پھر بات ہے جس حصے کو دیکھئے مہتاب سا روشن ہے یعنی بزم غزل میں جب جون ایلیا جیسے محترم عظیم شاعر کا کلام ساتویں نمبر پر ہے تو باقی کا کیا مقام ہو گا مگر ایک بات ضروری اس میں یہ ہے کہ شاہانہ ایلیا کا کلام پہلی مرتبہ پڑھا ہے یہ کون صاحبہ ہیں کیا جون ایلیا صاحب کی دختر ہیں بہر حال شاہانہ ایلیا کا کلام بڑا مضبوط خوبصورت اور دل نشیں ہے اور بقول جون ایلیا فلاں کی تھی غزل فلاں سے۔ فلاں کے زخم اچھے تھے فلاں سے شاہانہ کے زخم گلوں کی طرح مہکے ہوئے تھے خدا انہیں سلامت رکھے۔

اس کے علاوہ افسانوں میں تسنیم منٹو' نیلما سرور اور سریندر پرکاش کے افسانے بہترین لگے۔ جبکہ نظموں میں وزیر آغا اور جیلانی کامران کی نظمیں بھرپور نظمیں تھیں اور زبان و بیاں اور اثر انگیزی لئے ہوئے تھیں۔

جبکہ پنجابی نظموں غزلوں میں سلیم کاشر' آثم مرزا' اور عنائت اللہ کی غزلیں اور نظم خوبصورت تھیں خصوصاً عنایت اللہ کا یہ شعر علم ترے دا علم اے سانوں۔ مٹھی جھپٹی کوئی گل سنا کا جواب نہیں اس کے علاوہ بشریٰ اعجاز کے سفرنامے کا بڑا چرچا ہے اور جناب خامہ بگوش نے ان کی کیفی اعظمی سے ملاقات پر ایک کالم لکھ دیا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جناب خامہ بگوش اب تک اندر سے وہی "جماعت" والے ہیں اور انہیں ترقی پسندوں کی کھال کھینچنے کا جب بھی ذرا سا موقع ملتا ہے وہ یہ کام بڑی صفائی سے کرتے ہیں بہر حال مجھے ان سے دلی عقیدت بھی ہے کہ وہ جس سچائی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ ہمارے دیگر نقادوں کے ہاں مفقود بلکہ سرے سے ناپید ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ میری اس جسارت ک نظرانداز فرمادیں گے۔

رب راکھا۔

فقط آپ کا مخلص۔ فہیم شناس کاظمی

ادب کے ذوقِ نفاست ــــ اور
عذرا اصغر کے حُسنِ ادارت کا مرقع

ماہنامہ **تجدیدِ نو**

معاون : شبہ طراز

پوسٹ بکس ۲۹۸۶ - جی پی او - اسلام آباد

نوجوان شاعر زمان کنجاہی اب نئے انداز میں سامنے آتے ہیں

ماہنامہ **غنیمت**

دل نشین تحریروں کا حسین مجموعہ

سعادت بلڈنگ ، ایبٹ روڈ لاہور

علم و ادب اور حکمت و دانش
کی دنیا میں ایک اور اہم نام

ماہنامہ **جمالستان** لاہور

مدیرِ اعلیٰ
حکیم ولی الرحمٰن ناصر

- عوامی فلیٹس - ریواز گارڈن - لاہور

نئی آواز ــــ نیا انداز
ادب پرور ــــ دوست نواز

ادب دوست

اے جی جوش کی ادارت میں
شائع ہونے والا ماہنامہ

۳۳ - طارق بلاک - نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

نیرنگِ خیال

جامع اور وقیع ماہنامہ

مدیر : سلطان رشک

لیاقت روڈ - راولپنڈی

مقبول شاعرہ صبیحہ صبا کا **لفظوں کے شہر** کے بعد

دوسرا مجموعۂ کلام **تری صدا آئی** چھپ گیا ہے۔

خواب اور تتلیاں

حساس ادیب نصرت علی کی آئینہ صفت کہانیاں

جن میں معاشرے میں پھیلے ہوئے منافق صاحبانِ اختیار

اپنے نام نہاد اہل کردار کے اصل چہرے دکھائی دیتے ہیں!

تنقیدی رویوں کا بھرپور عکس

ادھورا مطالعہ

منظر امکانی

پاکستان پبلی کیشنز۔ پینوراما سنٹر فاطمہ جناح روڈ کراچی

رجحان ساز، منفرد انداز، بین الاقوامی ادبی رسالہ

ماہنامہ **انشاء**

مدیر : ف۔س۔ اعجاز

قیمت عام شمارہ ۸/ روپے ، زرِ سالانہ ۹۰ روپے

بیرونِ ملک : ۲۰ امریکی ڈالر، ۱۲ پونڈ سالانہ

رابطہ : ماہنامہ انشاء ۲۵۔ بی۔ زکریا سٹریٹ کلکتہ (انڈیا)